مجلسِ اقبال

حِصّہ دوم

(شرح مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق)

پرویز

مجلسِ اقبالؒ

حصّہ دوم

(شرح مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق)

پرویز

طُلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
۲۵بی، گلبرگ II لاہور ۵۴۶۶۰ پاکستان

نام کتاب	....	مجلسِ اقبال (شرح مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق)
مصنف	....	علاّمہ غلام احمد پرویزؒ
ناشر	....	طلوعِ اسلام ٹرسٹ 25۔بی گلبرگ 2۔لاہور 54660
مرتب	....	احمد حسین قیصرانی
طابع	....	دوست ایسوسی ایٹس
مطبع	....	عالمین پرنٹرز
ایڈیشن	....	اول (اگست ۱۹۹۷ء)
ضخامت	....	
قیمت	....	

فون: 876219-5753666-5764484 فیکس: 5764484
E-mail: tluislam@brain.net.pk
(http:\\www.toluislam.com)

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ
جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آغازِ سخن

مثنوی "اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی" علّامہ محمد اقبال مدظلہ العالی کی پہلی مطبوعہ تصنیف تھی۔ اس کی طباعت پر اس کا ایک نسخہ حضرت علّامہ نے اپنے دستخطوں سے، پرویزؒ صاحب کے داداجان، حکیم چوہدری رحیم بخش صاحب کو ارسال فرمایا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ہر دو بزرگوں کے اس سے پہلے کے مراسم تھے۔

اس مثنوی میں علّامہ اقبالؒ نے مسلکِ وحدت الوجود پر بالعموم اور حافظ پر بالخصوص، کڑی تنقید کی تھی۔ اس سے اہلِ تصوّف کی طرف سے ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ پرویزؒ صاحب کے داداجان خود بھی وحدت الوجودی اور حافظ کے مدّاح تھے۔ اس اعتبار سے انہیں، ان لوگوں کا ساتھ دینا چاہیئے تھا جو علّامہ اقبالؒ کے خلاف ہنگامہ کر رہے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اپنی وسعتِ قلبی کا ثبوت یوں دیا کہ انہوں نے یہ مثنوی خود، سبقاً سبقاً، پرویزؒ صاحب کو پڑھائی۔ اس درس و تدریس کے لئے انہوں نے جو انداز اختیار کیا، اس سے بقول پرویزؒ صاحب "حضرت علّامہ کی علمی عظمت اور احترام میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئے۔" علّامہ اقبالؒ سے پرویزؒ صاحب کا یہ پہلا قلبی تعارف تھا۔ اس وقت پرویزؒ صاحب کی عمر ۱۸/۱۷ سال تھی۔

اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں پرویزؒ صاحب جب لاہور آئے تو ان کے داداجان نے انہیں لاہور میں دو بزرگوں سے ملنے کی تاکید فرمائی۔ ایک امام الدّین نجّار، جو نواں کوٹ میں رہتے تھے اور جن کے متعلق اس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب ہیں اور دوسرے علّامہ اقبالؒ۔ پرویزؒ صاحب کہتے ہیں کہ وہ اوّل الذکر بزرگوار سے تو ایک آدھ مرتبہ ہی ملے لیکن حضرت علّامہؒ کے ہاں جو ایک دفعہ گئے تو:

بیا بمجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش

کے مصداق، ان کے تبحرِ علمی سے فیض یاب ہونے کے لئے بار بار اُن کی محفل میں گئے۔ ان ملاقاتوں سے پرویزؒ صاحب کے دل میں یہ احساس شدّت سے اُبھرا کہ داداجان نے اُن کا رُخ دانش کدۂ اقبالؒ کی طرف موڑ کر ان پر کتنا بڑا احسان

کیا ہے. انہی محفلوں میں پرویزؒ صاحب نے یہ حقیقت جانی کہ:

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

پرویزؒ صاحب کہتے ہیں کہ فیضانِ اقبالؒ سے ہی ان کی سمجھ میں یہ اہم نکتہ بھی آیا کہ قرآنِ کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہیئے اور کسی خارجی عنصر کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہیئے۔

پرویزؒ صاحب نے ایک نجی نشست میں راقم الحروف کو بتایا کہ ان ملاقاتوں کے ابتدائی دور میں ایک دن، حضرت علامہؒ نے ان سے استفسار کیا کہ پرویز تم ہمارے شعروں پر ہی سر دھنتے ہو یا تمہیں خود بھی کوئی ذوقِ سخن ہے. انہوں نے جواباً عرض کیا کہ ہاں میں بھی شعر کہتا رہا ہوں. اس پر علامہؒ صاحب نے ان سے اپنے کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی. پرویزؒ صاحب نے کہا کہ جب سے آپ کا کلام سامنے آیا ہے، میرے اپنے شعر پھیکے پڑ گئے تھے، اس لئے میں نے بیاض پھاڑ کر پھینک دی ہے. اس پر علامہؒ صاحب نے نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر تمہاری زندگی میں ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تمہارے نزدیک اقبالؒ کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں گے. پرویزؒ صاحب کہتے ہیں "اس کے بعد کچھ اور ملاقاتی آ گئے اور ہمارا یہ سلسلۂ کلام جاری نہ رہ سکا. لیکن حضرت علامہؒ کی اس بات نے مجھے خاصا پریشان کر دیا. یہ بات میرے امکانِ تخیّل سے باہر تھی کہ کبھی اقبالؒ کے اشعار بھی بے رنگ ہو سکتے ہیں." اتفاقاً چند روز تک پرویزؒ صاحب مجلسِ اقبال میں حاضر نہ ہو سکے اور ان کا یہ اضطراب اور پریشانی بڑھتی رہی. چنانچہ ایک شام وہ خاص اہتمام کر کے، محفل جمنے کے عمومی وقت سے ذرا پہلے حاضرِ خدمت ہوئے اور علامہؒ صاحب کو یہ بات یاد دلا کر پوچھا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ کبھی اقبالؒ کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں. اور اگر یہ ہو سکتا ہے تو ایسا کب ہو گا. حضرتِ علامہؒ نے جواب دیا کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے اور یہ اُس وقت ہو گا جب "قرآن تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو جائے گا." پرویزؒ صاحب نے مجھ سے کہا کہ علامہ اقبالؒ کا یہ انکسارِ محض تھا ورنہ بعد کے تجربہ نے بتایا کہ کلامِ اقبال درحقیقت ایک ایسا نادر ذریعۂ علم ہے جس سے قرآن فہمی کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں. اس واقعہ کے بعد یہ ملاقاتیں اور ان کے قلبی تعلقات روز بروز بڑھتے ہی چلے گئے. ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو، حضرتِ علامہ کی زندگی میں پہلا یومِ اقبال منایا گیا. اس تقریبِ سعید میں شرکت کے لئے احبابِ دہلی کا جو قافلہ علامہ محمد اسلم جیراجپوریؒ کی قیادت میں لاہور آیا، اس میں پرویزؒ صاحب، شیخ سراج الحقؒ اور جناب اسد ملتانی بھی شامل تھے. اس پہلے یومِ اقبال کی تقریب میں پرویزؒ صاحب نے اپنا فکر انگیز مقالہ بعنوان "اقبال اور قرآن" پیش کیا جو اب ان کی تصنیف "اقبال اور قرآن" کی جلد اوّل میں شامل ہے۔

۱۰ر جنوری ۱۹۳۸ء کو ان احبابِ دہلی نے حضرت علامہؒ سے ان کی رہائش گاہ 'جاوید منزل' واقع میورروڈ لاہور پر ملاقات کی۔ اس ملاقات میں جو روح پرور اور اہم موضوعات زیرِ بحث آئے، انہیں سید نذیر نیازی نے اپنی کتاب "اقبالؒ کے حضور ـ نشستیں اور گفتگوئیں" میں بڑے دلکش انداز میں تحریر کیا ہے۔ حضرت علامہؒ سے پرویز صاحبؒ کی یہ آخری ملاقات تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد، ملّتِ اسلامیہ کا یہ دانائے راز جو تمام عمر اپنی قوم کو جادۂ قرآن پر اس لئے لانے کی کوششوں میں مصروف رہا کہ ایک دن وہ یہ کہنے کے قابل ہو سکے کہ؛

زمین از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے
فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ کہتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو گیا کہ؛

سرودِ رفتہ باز آید کہ نہ آید
نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

جن حضرات نے عصرِ حاضر میں اپنے زمانہ کی علمی سطح اور اپنے دَور کے تقاضوں کے مطابق، قرآنی حقائق سمجھنے کی کوشش کی ہے، ان میں علامہ اقبالؒ کا اسمِ گرامی بڑی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی قرآنی فکر کے نتیجہ کے طور پر، اپنی تمام تر کوششیں قوم کو یہ باور کرانے میں صرف کر دیں کہ تمہارے اسلاف؛

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر

اور تمہاری حالت یہ ہے کہ؛

تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

انہوں نے قوم سے بالاستمرار یہ کہا کہ ہماری نکبت و زبوں حالی کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم نے اس ضابطۂ ہدایت کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے، جسے خالقِ کائنات نے بنی نوعِ انسان کی طرف، اپنی حتمی، مکمل اور غیر متبدل ہدایت و رہنمائی کے طور پر، اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰؐ کی وساطت سے یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ؛

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ○ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ

فَلْيَفْرَحُوْا ط هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ٥ (۱۰/۵۷-۵۸)

"اے بنی نوع انسان! تمہارے ربّ کی طرف سے ایک ایسا ضابطۂ ہدایت تمہاری طرف آگیا ہے جس میں ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دلوں کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے اور جو' ہر اس قوم کو جو اسے ضابطۂ حیات تسلیم کرلے کامیابیوں کی راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور انہیں سامانِ نشوونما عطا کرتا ہے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ اس قسم کے ضابطۂ ہدایت کا مل جانا' خدا کے فضل اور رحمت سے ہے (تم اسے کسی قیمت پر حاصل نہیں کرسکتے تھے)۔ لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ ہر اس شئے سے بہتر ہے جسے یہ لوگ جمع کرتے رہتے ہیں۔" (اور یہ ہے عید الفطر کی اہمیت!)

وہ عمر بھر اپنی اس پکار کو دہراتے رہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

تمہارے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار ہے ہی نہیں کہ تم اپنی فردوسِ گم گشتہ کو بارِ دگر حاصل کرنے کے لئے قرآنِ کریم ہی کی بارگاہِ عالیہ پر دستک دو۔ انہوں نے قوم سے کہا کہ:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت' جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شُد' جہاں دیگر شود

اور آخرالامر اسی ضابطۂ خداوندی کے مطابق' نظامِ زندگی کو دنیا کے کسی ایک خطّہ میں مشہود پیکر میں ڈھالنے کے لئے انہوں نے "پاکستان" کا تصوّر پیش کیا۔ انہوں نے پاکستان کا یہ تصوّر قوم کے سامنے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پیش کیا اور اس گوہرِ مقصود کے حصول کے لئے' انہوں نے اسلامیانِ ہند کی اس ملّی جنگ کی قیادت کے لئے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ جیسے دیدہ ور اور جرأتوں کے پیکر سالار کا انتخاب کیا۔ حضرت علامہ کا' ملّیہ اسلامیہ ہندیہ پر یہ وہ احسانِ عظیم ہے، جس کے صدقے میں' ان کا سفینۂ حیات ایک حسین بط کی طرح تیرتا ہوا ساحلِ مُراد پر آلگا۔

حضرت قائدِ اعظمؒ نے جب حصولِ پاکستان کے لئے اپنی تحریک کا آغاز کیا تو انہیں' خلافِ توقّع ایسے محاذ

پر بھی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا جو اُن کے اپنے (سیاسی) دائرۂ عمل سے باہر تھا۔ یہ مخالفت تھی ان مسلمان نیشنلسٹ علماء کی طرف سے جو ہندو کانگرس کی وظیفہ خوری میں اپنی قوم کی تمام ترمتاع ہندو کے ہاتھ بیچ ڈالنے کے درپے تھے۔ قائدِاعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کی اس محاذ سے مخالفت کے سدِباب کی ذمہ داری جناب غلام احمد پرویزؒ کے سپرد کی۔ میاں بشیر احمد صاحب نے بتایا کہ قائدِاعظمؒ کے اس انتخاب کے محرک علامہ اقبالؒ تھے۔ آپ نے پرویزؒ صاحب کا نام اپنے مذکورہ باہمی تعلقات اور پرویز صاحب کی فہمِ قرآن سے متعلق اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر تجویز کیا تھا۔ چنانچہ قائدِاعظمؒ کی تفویض کردہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے ۱۹۳۸ء میں ماہنامہ طلوعِ اسلام کا دہلی سے آغاز ہوا۔ اس زمانے کی طلوعِ اسلام کی فائلیں اس پر شاہد ہیں کہ پرویزؒ صاحب نے کس مہارت اور جانفشانی سے مجوّزہ مملکتِ پاکستان کے حصول کی ضرورت کو قوم کے سامنے پیش کیا۔ حضرت قائدِاعظمؒ اور ان کے رفقاء کی کوششوں کو بارگاہِ ایزدی سے شرفِ پذیرائی ملا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو نئی مملکتِ پاکستان دنیا کے نقشہ پر اُبھری جبکہ مخالفین پاکستان کے حصہ میں رُوسیاہی، ندامت اور شکست کے سوا اور کچھ نہ آیا۔ پرویزؒ صاحب کی یہ مساعیٔ جمیلہ اب "تحریکِ پاکستان اور پرویز" نامی کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مزید برآں پرویزؒ صاحب کی تحریکِ حصولِ پاکستان کے سلسلہ میں گراں قدر خدمات کے اعتراف میں انہیں حکومت کی طرف سے "تحریکِ پاکستان گولڈ میڈل" بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ ہے علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ سے پرویزؒ صاحب کے تعلقات اور تحریکِ پاکستان میں ان کی قومی خدمات کی ایک ہلکی سی جھلک۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ طلوعِ اسلام کا اجراء، حضرت علامہ اقبالؒ کے ایماء پر قائدِاعظمؒ کے ارشاد کی تعمیل میں ہوا تھا، اس لئے یہ مجلہ، تحریکِ پاکستان کی دینی اساس کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ فکر و پیغامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بھی بنا رہا۔ کلامِ اقبالؒ کا بیشتر حصہ، قرآنِ حکیم ہی کی تشریح و تفسیر پر مبنی ہے اور "اقبالؒ اور قرآن" پرویز صاحب کا موضوعِ خاص رہا ہے۔ اس نسبت سے کلامِ اقبال کی شرح میں جو مقام پرویزؒ صاحب کو حاصل ہے، وہ شاید ہی کسی اور صاحبِ فکر کو نصیب ہو سکے۔ آپ اپنی زندگی میں کلام و پیغامِ اقبال کے مستند ترین شارح کی حیثیت سے تسلیم کئے جاتے رہے ہیں۔ پرویزؒ صاحب کے، فکر و پیغامِ اقبال پر دیگر خصوصی مقالات اب "اقبالؒ اور قرآن" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۵۱ء میں، مصر کے نامور دانشور، صاحبِ قلم اور کلامِ اقبالؒ کے شیدائی، ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ، مملکتِ مصر کے نئے سفیر کی حیثیت میں پاکستان میں تشریف لائے۔ اس سے پہلے آپ فرانس میں یہ فرائض ادا

کر رہے تھے: جہاں انہوں نے اقبالؒ کے "پیامِ مشرق" کا منظوم عربی ترجمہ کیا تھا۔ قیامِ فرانس کے دوران کسی تقریب میں آپ کو کسی نے بتایا کہ اگر آپ کلامِ اقبال سے کماحقہٗ استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو پاکستان جائیے۔ وہاں آپ کو ایک پاکستانی اقبال شناس، کلامِ اقبالؒ کی حقیقی رُوح سے روشناس کرائے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب، اس وقت کے فرمانروائے مصر، شاہ فاروق سے اپنی خصوصی درخواست پر پاکستان کے لئے سفارت حاصل کر کے یہاں آئے اور سیّد عبدالواحد صاحب (سیکرٹری مجلسِ اقبال) کے توسط سے آپ نے پرویزؒ صاحب سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ پرویزؒ صاحب سفارت خانہ مصر گئے تو اپنے ذہن میں ایک عجیب سا تصوّر لے کر۔ وہ کہتے ہیں کہ "سفارت خانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھئے۔ شان و شوکت، ٹھاٹھ باٹھ، تصنّع، تکلّف، ظاہرداری اور دیگر بے شمار بظاہر حسین، لیکن بباطن خبیث دخترانِ ماڈرن ڈپلومیسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ تن کی دنیا ہے جو "سُود و سودائے مکر و فن" سے معمور ہے، نہ کہ "سوز و مستیٔ جذب و شوق" سے آباد من کی دنیا۔ اس جہانِ گندم و جو میں اُن درویشوں کا ذکر کہاں جن کے قلوب واذہان میں قرآن اور اقبالؒ نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطرابِ موج کے ساتھ ساتھ، سکونِ گہر بھی ہو، جو بدلتے رہنے کے باوجود نہ بدلیں اور جن کی حالت یہ ہو کہ،

زبرونِ در گذشتم، ز درونِ خانہ گفتم
سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

بہرحال پرویزؒ صاحب سفارت خانہ مصر گئے، اس حال میں کہ آیا نہیں، لایا گیا ہوں۔ سفیرِ مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ سے ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد پرویزؒ صاحب نے یہ محسوس کیا کہ وہ کاخِ نمائندۂ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرۂ درویش میں ہیں۔ وہ درویشِ خدامست، نہ شرقی ہے نہ غربی۔ ایک طرف اُن کا علم و فضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا، اس میں سراسر طالب علمانہ تجسّس تھا۔ دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انہیں سراپا سوز و گداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبالؒ ہی کا فیض ہو سکتا تھا۔ اب پرویزؒ اور عزامؒ اس دنیا میں تھے جہاں تمام حجابات یک لخت اُٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے "من تو شُدم، تو من شُدی" کی حقیقی الف بین قلوبکم کی تصویر بن جاتے ہیں۔ یہ ملاقات مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ کا نقشِ اوّل بنی۔

چنانچہ مجلسِ قلندرانِ اقبالؒ کی تاسیس ہوئی اور سفارت خانہ مصر میں اس کی نشستوں میں ضربِ کلیم، بالِ جبریل، ارمغانِ حجاز (حصہ اُردو)، جاوید نامہ، اسرار و رموز، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق اور بانگِ درا لفظاً لفظاً پڑھی گئیں اور ان کی تشریح کی گئی۔ سفیرِ اقبالؒ ڈاکٹر عزامؒ نے ان شرحوں کو منظوم عربی کا پیرہن دیا اور پوری دنیائے

عرب کو فکرِ اقبالؒ کے نور سے منوّر کر دیا۔ انہوں نے علّامہ اقبالؒ کے عرب دنیا میں تعارف کی غرض سے ایک خود مکتفی کتاب بعنوان "محمد اقبال۔ سیرتہ، شعرہٗ وفلسفتہ" بھی تالیف کی۔

ان مجالس میں ظاہر ہے کہ شیخِ قلندراں کا منصب پرویزؒ صاحب ہی کے لئے مختص تھا کیونکہ کلامِ اقبالؒ وہی پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے۔ ضربِ کلیم کے عربی ترجمہ کا تعارف بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے پرویزؒ صاحب ہی سے لکھوایا' جو اب پرویزؒ صاحب کی تصنیف "اقبال اور قرآن" جلد اوّل میں شامل ہے۔

یہ سلسلہ چار سال تک جاری رہا اور اس مجلس کی آخری نشست ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو منعقد ہوئی جس میں مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کا آخری باب زیرِ مطالعہ رہا۔ اس کے بعد سفیرِ اقبالؒ، پاکستان سے رخصت ہو کر سعودی عرب چلے گئے۔

۱۹۵۵ء میں بعض احباب کی طرف سے تقاضے موصول ہونا شروع ہوئے کہ طلوعِ اسلام میں پیغامِ اقبالؒ کو عمومی طور پر پیش کرنے کے علاوہ' اس میں کلامِ اقبالؒ کی تشریح مسلسل اور التزاماً شائع ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس کے لئے سب سے پہلے مثنوی اسرار و رموز کا انتخاب کیا گیا کہ حضرت علّامہ کی پہلی مطبوعہ کتاب بھی یہی تھی۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۹ء تک اس مثنوی کی شرح طلوعِ اسلام میں شائع ہوتی رہی' (جو اب کتابی شکل میں شائع کی جا چکی ہے)۔

مثنوی اسرار و رموز کی شرح کے مطالعہ سے' ملّتِ اسلامیہ پاکستانیہ' قوالوں والے اقبال سے قطع نظر' اس حقیقی اقبالؒ سے آشنائی حاصل کر سکے گی جس کے شب و روز' اپنی امّتِ مسلمہ کے لئے اندیشہ ہائے فکر و غم سے روشن رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اسے' پرویزؒ صاحب کے تبحرِ علمی کے اس گوشہ سے بھی آگاہی مل سکے گی اور پھر شاید اسے یہ احساسِ محرومی بھی ہو کہ پرویزؒ صاحب کی یہ شرح اس کے سامنے اب تک کیوں نہ آ سکی۔

ایک وضاحت جو نہایت ضروری ہے! ہمارے ہاں کا اہلِ علم و تحقیق طبقہ آئے دن اس نکتہ پر بحث کرتا ہے کہ' حضرت علّامہ کے فلسفہ اور فکر کے مآخذ کیا تھے یعنی انہوں نے یہ خیالات کہاں سے لئے تھے۔ کوئی ایک اگر اس کے لئے نطشے کا نام لیتا ہے تو دوسرا برگساں کا۔ کوئی انہیں الیگزنڈر کا خوشہ چیں بتاتا ہے' تو کوئی سپنوزا کا۔ کاش ان میں سے کوئی خود اقبالؒ سے بھی پوچھ لیتا کہ آپ کے فلسفہ و پیغام کے مآخذ کیا ہیں۔

علّامہ اقبالؒ نے اس بارے میں اتنی وضاحت سے بات کی ہے کہ اس کے پیشِ نظر' اس باب میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔ وہ مثنوی' مسافر' میں کہتے ہیں کہ

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است
ایں دو قوّت اعتبارِ ملّت است

اور

غیرِ قرآں غم گُسارِ من نہ بود
قوّتش ہر باب را برمن کشود

اسی لئے

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام
شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

انہوں نے مثنوی اسرار و رموز کے آخری باب "عرضِ حال مصنّف بحضور رحمۃ للعالمینؐ" میں اس سوز و گداز سے کہا ہے کہ اگر اس کے برعکس صورت یہ ہو کہ:

گر دِلم آئینۂ بے جوہر است
در بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

تو

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن
ایں خیاباں را زِ خارم پاک کُن

اور اس کے بعد اپنے لئے اتنی سخت تعزیر قبول کرتے ہیں کہ حضورؐ سے عرض کرتے ہیں کہ ایسی صورت میں

روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

لیکن اگر میرا یہ دعویٰ درست ہے اور

گر دُرِ اسرارِ قرآں سُفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

تو

عرض کُن پیشِ خدائے عزّ و جل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

مثنوی اسرار و رموز کی شرح شائع کرتے وقت ہم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ علامہ اقبالؒ کی جن کتابوں کی شرح پرویزؒ صاحب اپنی زندگی میں کر گئے ہیں، ہم آئندہ انہیں انشاء اللہ قوم کے سامنے لاتے رہیں گے۔

اس وعدہ کی ایفا میں اب "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کی شرح پیش کی جا رہی ہے۔

چونکہ اس مثنوی کے افتتاحیہ میں محترم پرویزؒ صاحب نے خود ہی حضرت علامہ محمد اقبالؒ اور اس مثنوی سے متعلق مفصل تعارف کرا دیا ہے، اس لئے ہم اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس مثنوی کے بارے میں اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ اس کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ جب سیاست، وحی کی روشنی سے محروم، عقلِ بے باک کی ڈور سے چلتی ہے تو اس کا نتیجہ کس قدر انسانیت سوز اور فساد انگیز ہوتا ہے، لیکن جب وہ وحی کی راہ نمائی میں سفرِ حیات طے کرتی ہے تو اس دنیا کا نقشہ کس طرح جنّت بداماں ہو جاتا ہے۔

اب آپ اپنا مطالعہ شروع کیجئے اور دیکھئے کہ اقوامِ عالم میں عروج و زوال کے اصول کیا ہیں۔ کلامِ اقبالؒ اور پرویزؒ صاحب کی شرح، قرآن السعدین ہیں!

لاہور۔ پاکستان
اگست ۱۹۹۷ء

محمد عُمر دراز
رُکن طلوعِ اسلام ٹرسٹ
۲۵۔ بی، گلبرگ ۲۔ لاہور

مجلسِ اقبالؒ

اِفتتاحیہ

بیا بمجلسِ اقبالؒ ویک دو ساغر کش
کہ گرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

مثنوی ــــــ پس چہ باید کرد اَے اقوامِ شرق

طلوعِ اسلام میں ایک مستقل عنوان ــــــ مجلسِ اقبالؒ ــــــ قائم کیا گیا تھا. اس عنوان کے تحت حکیم الامّت علّامہ اقبالؒ کی دو ابتدائی مثنویوں (اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی) کی شرح اس انداز سے (مسلسل) پیش کی گئی تھی کہ اقبالؒ کی فکر اور ان کا پیغام، قرآنِ کریم کی روشنی میں نکھر کر سامنے آجاتے تھے. اس اندازِ تشریح کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی. حتّٰی کہ ان مثنویوں کے خاتمہ پر قارئین کی طرف سے تقاضا ہوا کہ انہیں کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ ان کی افادیت محفوظ اور عام ہو جائے (جس کی تعمیل کر دی گئی ہے اور اب یہ کتاب "مجلسِ اقبال. شرح مثنوی اسرار و رموز" کے نام سے شائع ہو چکی ہے ــ طلوعِ اسلام ٹرسٹ).

اس اثنا میں ایسے اہم عملی مسائل سامنے آنے شروع ہو گئے جنہیں ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا. اس وجہ سے بعض مستقل عنوانات کو پسِ پشت ڈالنا پڑا ــ کیا کیا جائے ــــ دامانِ نگہ تنگ و گُلِ حُسنِ تو بسیار. انہی میں "مجلسِ اقبال" کا عنوان بھی تھا. اس عنوان کی تجدید کے لئے قارئین کی طرف سے مسلسل تقاضے موصول ہوتے رہے ــــ ہمیں خود بھی اس کا شدّت سے احساس تھا.

ہمارے اس احساس کو تیز تر کرنے کا باعث ایک اور خیال بھی ہوا. آپ نے دیکھا ہوگا کہ قوم آہستہ آہستہ اقبالؒ کو فراموش کر رہی ہے. بلکہ یوں کہیئے کہ اسے قریب قریب فراموش ہی کر دیا گیا ہے. ویسے

زُود فراموشی

تو ایک جذباتی اور ہنگامہ پرور قوم کے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے. اس کے کسی عمل میں بھی استقامت نہیں ہوتی. وہ بگولے کی طرح اُٹھتی ہے اور آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتی ہے. ہماری حرکت و عمل کی ساری تاریخ ہماری اس نفسیات کی شاہد ہے. قوم نے اقبالؒ کو یاد کرنا شروع کیا تو اس ہنگامہ آرا شدت کے ساتھ در و دیوار اس نام اور پیام سے گونج اٹھے اور اس کے بعد فراموش کیا تو اس حیرت افزا سکوت کے ساتھ کہ گویا یہاں کی فضائیں اس تذکرہ سے کبھی شناسا ہی نہیں تھیں. قوم کی اس نفسیات کے علاوہ اقبالؒ کے پیغام کو نگاہوں سے اوجھل کرنے میں، یہاں بعض اور محرکات بھی کارفرما رہے ہیں ــــــ اور کارفرما ہیں ــــــ نتیجہ اس کا یہ کہ اسلام کا یہ اتنا بڑا پیغام بردار اور قوم کا ایسا عظیم محسن، ماضی کی داستان بن کر رہ گیا ہے. اس سے اقبالؒ کا کچھ نہیں بگڑا نہ بگڑے گا. وہ تو ان زندہ جاوید شخصیتوں میں سے ہے جن کے متعلق بجا طور پر کہا گیا ہے ــ ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما ــ اس سے قوم ایک گراں بہا متاع سے محروم ہو رہی ہے ــ اور ستم بالائے ستم کہ اسے اس محرومی کا احساس تک نہیں ہو رہا. خود حضرت علامہؒ کے الفاظ میں ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اندریں حالات طلوعِ اسلام اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ فکرِ اقبال کے تذکرہ کو بدستور زینت دہِ محفل رکھے. فریضہ اس لئے کہ طلوعِ اسلام خود حضرت علامہ کے ایما سے جاری ہوا. یہ نام بھی انہی کا تجویز فرمودہ ہے. اور اس

اقبالؒ کی اہمیّت

کے بعد یہ انہی کی یاد میں جاری رہا. تحریکِ پاکستان کے دوران میں، اس نے، انہی کی فکرِ جہاں تاب کی روشنی میں، انگریز، ہندو اور قومیت پرست مسلمانوں کے خلاف چومکھی لڑائی لڑی. اور قیامِ پاکستان کے بعد یہ انہی کے تصوّرات کے مطابق معاشرہ کی تشکیلِ جدید کے لئے کوشاں رہا، کوشاں ہے اور بہ توفیقِ ایزدی، کوشاں رہے گا. یہ اس لئے کہ اقبالؒ کے یہ تصوّرات خود قرآنِ کریم کی شمع نورانی سے مستنیر ہیں. اقبالؒ سے ہماری عقیدت بھی اسی بنا پر ہے. اور یہی وجہ ہے کہ ہم اقبالؒ کی فکر کو قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھتے اور پیش کرتے ہیں.

اس سلسلہ کی تجدید کے لئے ہم نے، سب سے پہلے، ان کی مشہور مثنوی
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

کا انتخاب کیا ہے۔ یہ مثنوی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی، یعنی ان کی وفات سے صرف دو سال قبل۔

زیرِ نظر مثنوی

یہ بڑی مختصر سی کتاب ہے لیکن یوں سمجھئے کہ اس میں فکرِ اقبال نچڑ کر آگیا ہے۔ انہوں نے جس پیغام کی ابتدا اسرار و رموز سے کی تھی اور پھر اسے تمام عمر مختلف طرق و اسالیب سے دہراتے رہے، اس مثنوی میں وہ نہایت جامعیت کے ساتھ سامنے آگیا ہے۔ اس کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ جب سیاست، وحی کی روشنی سے محروم — یا بیباک ہوجاتی ہے (جیسا کہ مغرب میں ہوا) تو اس کا نتیجہ کس قدر انسانیت سوز اور فساد انگیز ہوتا ہے۔ اور جب وہ وحی کی راہ نمائی میں جادہ پیما ہوتی ہے تو اس دنیا کو کس طرح جنّت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اقبالؒ نے اپنی تنقید کا ہدف براہِ راست اہلِ مغرب کو قرار دیا تھا۔ اس لئے کہ ان کے زمانے میں سیاستِ بیباک کا سرچشمہ اور اوّلین آماجگاہ وہی سرزمین، اور وہیں کی اقوام تھیں۔ لیکن آج اس موضوع کی اہمیت، خود ہمارے ہاں مغرب سے بھی زیادہ ہے۔ اس لئے کہ پاکستان اس وقت تک اسی قسم کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ یہاں کا قدامت پرست طبقہ

پاکستان کے حالات

ایک ایسے نظام کی طرف دعوت دیتا ہے جس میں نہ اپنے حقیقی مفہوم میں دین ہے اور نہ ہی قابلِ عمل سیاست۔ اس سے تنگ آکر جدّت پسند طبقہ ایک ایسے نظام کا متمنّی ہے جس میں مذہب کو پرستش گاہوں کی چار دیواری میں محبوس کرکے سیاست کو اس سے بیباک رکھا جائے۔ (اسی کو سیکولرازم کہتے ہیں)۔ لہٰذا پاکستان میں اس کی اشد ضرورت ہے کہ اس نظامِ معاشرہ کے خدّوخال کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے۔ جسے قرآنِ کریم کی روشنی میں اقبال نے پیش کیا تھا۔ اور جس کی عملی تشکیل کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصوّر قوم کو دیا تھا۔ لیکن مغرب کی سیاستِ بیباک تک آنے سے پہلے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے! یہ سوال درحقیقت اس تمام بحث کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی کے تمام معاملات تنہا عقلِ انسانی کی رُو سے طے کئے جا سکتے ہیں یا اس کے لئے وحی کی رہنمائی

عقل اور وحی

کی بھی ضرورت ہے؟ اہلِ مغرب کا فیصلہ یہ تھا کہ عقل کے علاوہ کوئی اور سرچشمۂ علم نہیں اس لئے انسانی معاملات بہ تمام و کمال تنہا عقل کی رُو سے طے ہو

سکتے ہیں. ہیکل کے الفاظ میں:

ہم دنیا کے متعلق صحیح علم اور اس کے مسائل کا صحیح حل، صرف عقل کی رُو سے دریافت کر سکتے ہیں. عقل انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ ہے. یہی وہ خصوصیت ہے جو اسے ہدایات سے ممتاز کرتی ہے. وحی یا معتقدات کا تصور دانستہ یا نادانستہ یکسر فریب پر مبنی ہے[1].

اقبالؒ نے اس باطل تصوّر کی پُرجوش اور پُر زور تردید کی اور کہا کہ تنہا عقلِ انسانی معاملات کو حل کرنے کے لئے کافی نہیں. اسے وحیؔ کے تابع رکھنا ضروری ہے. اس بنیادی نقطہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس نے اس مثنوی کی ابتدا ان چار اشعار سے کی ہے جو

بخوانندۂ کتاب

کے عنوان سے مثنوی میں درج کئے گئے ہیں. پہلا شعر ہے.

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

حرم (دین کے مقتضیات) کو، عقل کی بے باکی اور سرکشی سے سخت خطرہ لاحق ہوگیا ہے. اس کی مدافعت اور مقابلہ کے لئے میں مملکتِ عشق سے تازہ سپاہ لے کر اٹھا ہوں.

اقبالؒ کے ہاں آپ کو، عقل و عشق، خرد و جنوں، خبر و نظر، ذکر و فکر جیسی تقابلی اصطلاحات عام ملیں گی. اس کا سارا کلام ان اصطلاحات سے معمور ہے. جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے، اگر ان اصطلاحات میں عشق، جنون، نظر، ذکر وغیرہ سے مراد وحیٔ خداوندی اور اس کی رُو سے عطا شدہ علم لے لیا جائے اور عقل و خرد و خبر و فکر سے مفہوم وہ "فکرِ گستاخ" جو اپنے آپ کو وحی کی روشنی سے مستغنی سمجھ کر اس کی عائد کردہ حدود سے سرکشی اختیار کر لیتا ہے تو بات بالکل واضح ہوجاتی ہے. لیکن ہمارے ہاں کا فلسفیانہ ذوق رکھنے والا طبقہ، اس سے کچھ اور مراد لے کر قدیم متکلمانہ بحث میں اُلجھ جاتا ہے. فلسفہ کی دنیا میں، علم کے دو سرچشمے تسلیم کئے جاتے ہیں — ایک عقل اور دوسرا وجدان. صوفیانہ کشف والہام اور وجد و حال، سب وجدان کے دائرے میں

عقل و عشق کا تصادم

1- RIDDLE OF THE UNIVERSE ---- ERNST HAECKEL

آجاتے ہیں۔ (واضح رہے کہ وحیٔ نبوّت اس سے یکسر الگ حقیقت ہے)۔ وجدان کے حامی، عقل کی سخت تنقیص کرتے ہیں اور اس کے پیچھے لٹھ لئے لئے پھرتے ہیں۔ فلسفی اور صوفی کی جنگ وجدال کی داستان بڑی قدیم اور مسلسل ہے۔ صوفی، پائے استدلال کو چوبیں اور سخت بے تمکین قرار دیتا ہے۔ استدلالی فلسفی صوفی کی باطنی کیفیات کو واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔ اسے عجب اتفاق کہیئے کہ اقبالؒ بھی باطنی واردات و کیفیات کا قائل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل و وجدان کی کشمکش کی بحث کرتے ہیں، تو اقبالؒ کو "وجدانیوں" کی صف میں کھڑا کر کے، عقل کا بدترین دشمن قرار دیتے ہیں۔ اقبالؒ کی پوزیشن اس باب میں منفرد ہے۔ وہ جب عقل کے مقابلہ میں عشق کو لاتے ہیں تو اس سے ان کی مراد وحیٔ نبوّت ہوتی ہے نہ کہ صوفیانہ وارداتِ باطنی۔ اور عقل سے اُن کا اشارہ ہوتا ہے اُس عقل کی طرف جو وحی سے سرکشی برتنے، نہ کہ مجرّد عقل۔ یہ اس لئے کہ ایک تو قرآن، کشف والہام جیسے وجدان کی کوئی حیثیت ہی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اکتسابی علم کا ذریعہ عقل اور اس کے مشاہدات کو قرار دیتا ہے۔ اور غیر اکتسابی علم کا ذریعہ وحی کو، جو خاصۂ نبوّت ہے۔ اور نبوّت چونکہ نبیٔ اکرمؐ پر ختم ہو چکی ہے۔ اس لئے اب علم کا ذریعہ قرآن اور اس کی روشنی میں کام کرنے والی عقل کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم، عقل کو بڑا بلند مقام عطا کرتا ہے۔ وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو بدترین مخلوق بلکہ جہنّمی قرار دیتا ہے۔

صحیح مفہوم اقبالؒ کا دعوٰے ہے کہ اس نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ کہا ہے اسی کی روشنی میں کہا ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اقبالؒ، اس قدر اہم اور بنیادی مسئلہ میں، قرآن کی تعلیم کے علی الرّغم، عقل کی تنقیص کرے اور وجدان کو اس کے مقابلہ میں، یقینی ذریعۂ علم اور قابلِ اعتماد راہ قرار دے[1]۔

بہرحال ہم اقبالؒ اور قرآن کے مطالعہ سے اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان کے ہاں عشق و نظر وغیرہ سے مراد وحیٔ نبوّت (قرآنِ کریم) ہے۔ اور عقل سے مراد مغرب کا وہ نظریہ جو وحی کی راہ نمائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ

---

[1] اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ حضرت علّامہ علم و دانش کی ایسی بلندیوں کے باوجود بالآخر انسان تھے اور ہر انسان کی طرح ان سے بھی غلطی ہو جانے کا امکان تھا اس سے ان کے مقام کی بلندی میں فرق نہیں آجاتا۔ انہوں نے بہ حیثیتِ مجموعی جو کچھ کہا ہے وہ قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے۔

اس نظریہ کی تنقیص کرتے ہیں؟ اس سے ان کی نگاہ میں دین کے مقتضیات کو سخت خطرہ ہے۔ وہ مسلمانوں کو' بالخصوص ہمارے ہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو' اس خطرہ سے آگاہ کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ کے لئے وحی کی بارگاہ سے دلائل و شواہد کا لشکرِ جرّار اکٹھا کر کے میدان میں آتے ہیں۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں۔

زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ اُو را
جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرداست

لوگ خواہ مخواہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ عقل اور وحی دو متضاد عناصر ہیں جو ایک دوسرے میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ یہ صحیح نہیں۔ وحی کی قبا ایسی ہے جو عقل کی قامت پر موزوں آتی ہے۔ وحی خود اپنے آپ کو عقلی دلائل سے منواتی ہے۔ لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ انسانی عقل کی جو سطح ہو وہ اس کے مطابق دلائل دے کر اسے حقیقت کا قائل کراتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ عقل' زندگی کے غیر متبدّل اصولوں کو دریافت نہیں کر سکتی' یہ کام وحی نے کیا ہے۔

عقل اور وحی کا تعلق

لیکن جو اصول وحی نے پیش کئے ہیں وہ سمجھے عقل ہی کی رُو سے جا سکتے ہیں۔ اس لئے عقل اور وحی میں وہی رشتہ ہے جو انسانی آنکھ اور سورج کی روشنی میں ہے۔ انسانی آنکھ روشنی کے بغیر بیکار ہے اور جس روشنی سے فائدہ اٹھانے والی کوئی آنکھ نہیں وہ روشنی اپنا مقصد پورا نہیں کرتی۔

تیسرا شعر ہے۔

بآں مقام رسیدم چو در برش کردم
طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است

میں وحی کے اتباع سے' یا اپنی فکر کو اس سے ہم آہنگ کر لینے سے' اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ عقل میرے در و بام کے طواف کرنے کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب عقل' وحی کے پیش کردہ حقائق کا ادراک کر لیتی ہے اور اس کی عظمتوں سے آشنا ہو جاتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ کس قدر بلند اور باعظمت ہو گئی ہے۔ عقل کے لئے وحی کا اتباع' باعثِ ہزار فخر و مباحات ہے۔ اس قوم کے مقام کے کیا کہنے جو وحی کی راہ نمائی میں عقل سے کام لے کر سفرِ حیات طے کرے۔ یہی قوم' امامتِ اقوام کی سزاوار ہے۔ وحی ہر قدم پر عقل کی نگرانی کرتی رہتی ہے کہ وہ کسی گڑھے میں نہ جا گرے۔ کہیں غلط موڑ نہ مُڑ جائے۔

اس لئے اقبالؒ نے چوتھے شعر میں کہا ہے کہ

احتسابِ کائنات

گماں مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست
نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

اگر عقل کو انسانی معاملات میں آخری اتھارٹی تسلیم کر لیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں رہتی جو اس کا فیصلہ کر سکے کہ عقل نے جو قدم اٹھایا ہے وہ صحیح ہے یا غلط. لیکن اگر اسے وحی کے تابع رکھا جائے تو وحی قدم قدم پر اس کا احتساب کرتی رہتی ہے. اس لئے قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین کو شُہَدَاءَ عَلَی النَّاسِ (2/143) قرار دیا ہے. یعنی اقوامِ عالم کے اعمال کی نگران. ان کی نگرانی درحقیقت وحی کی نگرانی ہے.

اصل یہ ہے کہ جب عقل کو تنہا چھوڑ دیا جائے تو انسانی جذبات، رجحانات، میلانات اور مفادات کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے. اس طرح ایک فرد یا ایک گروپ کے مفادات کا ٹکراؤ، دوسرے فرد یا گروپ کے مفادات سے ہوتا ہے. اس کا نتیجہ فساد فی الارض ہے. لیکن اگر عقل، وحی کے مقرر کردہ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن جائے، تو وہ نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کا موجب بن جاتی ہے، جس سے یہ دنیا جنّت میں تبدیل ہو جاتی ہے.

بس یہ ہے اقبالؒ کے پیغام کا ماحصل جسے اس نے انتہائی ایجاز و جامعیت کے ساتھ اس مثنوی میں پیش کیا ہے. اس کی تمہید آیندہ باب میں سامنے لائی جائے گی. وھوالمستعان.

باب ۲

تمہید

گذشتہ صفحات میں ہم نے علاّمہ اقبالؒ کی اس مثنوی کا ابتدائیہ پیش کیا تھا جس میں انہوں نے قارئین کتاب کو مخاطب کر کے بتایا تھا کہ جو کچھ اس مثنوی میں پیش کیا گیا ہے اس کا ماحصل کیا ہے ــــ وہ ماحصل یہ تھا کہ عقل کو وحی کے تابع رکھنے سے شرفِ انسانیت حاصل ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد کتاب کی تمہید شروع ہوتی ہے جس میں حضرت علاّمہؒ اپنے مخصوص انداز کے مطابق پیر رومیؒ کی معیت میں رونق افروزِ محفل ہوتے ہیں۔ پہلے تین اشعار میں مولانا رومؒ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے۔

پیرِ رومیؒ کا تعارف

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب
خیمہ را از کہکشاں سازد طناب
نورِ قرآں درمیانِ سینہ اش
جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش

مولانا جلال الدّین رومیؒ ۱۲۰۷ء میں بلخ میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زمانہ نیشاپور میں گزرا اور خواجہ فرید الدّین عطارؒ کے زیرِ تلمیذ رہے۔ پھر قونیہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور حضرت شمس تبریزیؒ کی صحبت میں تصوف کے منازل طے کئے۔ مولانا رومؒ وحدت الوجود کے قائل اور پیامبر رہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور مثنوی میں اس مسلک کی تبلیغ کی ہے۔ علاّمہ اقبالؒ انہیں اپنا "پیرو مرشد" کہہ کر پکارتے ہیں اور اپنے کلام میں

اکثر و بیشتر ان کا ذکر کرتے ہیں. یہ چیز ارباب فکر و نظر کے لئے فی الواقعہ بڑی حیرت انگیز ہے کہ علّامہ اقبالؒ جو تصوّف کو اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا قرار دیتے ہیں. (اور وہ فی الواقعہ اجنبی پودا ہے) اور فلسفۂ وحدت الوجود کے امام شیخ اکبر ابنِ عربی کی فصوص الحکم کے متعلّق لکھتے ہیں کہ اس میں الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں، وہ اسی تصوّف اور وحدت الوجود کے پیامبر رومیؒ کو اپنا مرشد کس طرح تسلیم کرتے ہیں! بالخصوص جب دوسری طرف ان کا دعوٰے ہے کہ وہ (علّامہ اقبالؒ) جو کچھ کہتے ہیں قرآن کی روشنی میں کہتے ہیں. یہ واقعی ایک ایسا معمّہ ہے جسے ہم حل نہیں کر سکتے (اور شاید کوئی بھی حل نہیں کر سکتا). ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ رومیؒ کے ہاں ایک جوش اور حرارت پائی جاتی ہے' اور ان کی یہی چیز ہے جو اقبالؒ کو بھا گئی ــــ یہ خصوصیّت اقبالؒ کو کہیں بھی نظر آئے' وہ اسے بہ نگاہِ پسندیدگی دیکھتے اور اس کی تعریف کرتے ہیں ــــ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی کے مسلک یا نظریہ کو قرآنی قرار دینے کے لئے تنہا یہ چیز تو کافی نہیں ہو سکتی.

اہلِ تصوّف کا عقیدہ ہے کہ فلسفی' حقیقت کا ادراک ظنّ و قیاس کی رُو سے کرتا ہے' لیکن' صوفی' حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب پاتا ہے اور آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر لیتا ہے. لیکن یہ عجیب تماشا ہے کہ جب ابنِ عربیؒ حقیقت کو بے نقاب دیکھتے ہیں تو وہ انہیں" وحدت الوجود" نظر آتی ہے' اور اسی حقیقت کو جب حضرت مجدّد سرہندیؒ بے نقاب دیکھتے ہیں' تو وہ انہیں (ابنِ عربیؒ کی حقیقت کے بالکل برعکس) "وحدتِ شہود" دکھائی دیتی ہے ــــ اور دونوں کے متعلّق اہلِ تصوّف کا عقیدہ ہے کہ انہوں نے حقیقت کو بے نقاب دیکھا تھا.

بہرحال ہمیں ان "مقامات" سے کچھ واسطہ نہیں. ہمارے نزدیک تو کسی مسلک یا نظریہ کے "حقیقت" ہونے کا معیار ایک ہی ہے. اور وہ یہ کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہو. وہ ابنِ عربیؒ کے ہاں ہو یا امام سرہندیؒ کے ــــ رومیؒ کے اشعار میں ہو یا اقبالؒ کے پیغام میں ــــ ان کے ہاں جو بات قرآن کے مطابق ہو گی اسے ہم سر آنکھوں پر رکھیں گے. جو قرآن کے خلاف ہو گی اسے ہم مسترد کر دیں گے.

پیرِ رومیؒ کے متعلّق اقبالؒ نے مذکورہ صدر تین اشعار میں کہا ہے کہ وہ روشن ضمیر تھے اور کاروانِ عشق و مستی کے سالارِ قافلہ ــ ان کا مقام چاند اور سورج سے بھی زیادہ بلند تھا. ان کا سینہ' قرآنِ کریم کے نور سے منوّر تھا' اور آئینۂ ادراک' جمشید کے جامِ جہاں نما سے بھی زیادہ مصفّا.

اس کے بعد وہ کہتے ہیں.

از نئے آں نے نوازِ پاک زاد
باز شورے در نہادِ من فتاد

مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی کی ابتدا اس شعر سے کی ہے.

بشنو از نَے چو حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

اس نسبت سے حضرت علامہؒ نے پیر رومیؒ کو نَے نواز کہا ہے اور ان کے پیغام کو "نَے" سے تعبیر کیا ہے ' اگرچہ زبانِ شعر میں' ہر پیغام رساں کو "نَے نواز" کہہ کر پکار لیا جاتا ہے. اقبالؒ کا کہنا یہ ہے کہ پیرِ رومیؒ کے پیغام نے میرے اندر شورِ قیامت برپا کر دیا.

رومیؒ کا پیغام

گفت جانہا محرم اسرار شُد
خاور از خوابِ گراں بیدار شُد

اس نے مجھ سے کہا کہ اب زمانے کے انداز بدل رہے ہیں. چھپی ہوئی حقیقتیں بے نقاب ہو رہی ہیں. پوشیدہ راز اُبھر کر سامنے آ رہے ہیں. مشرق' اپنی صدیوں کی نیند سے بیدار ہو رہا ہے.

جذبہ ہائے تازہ اُو را دادہ اند
بند ہائے کہنہ را بکشادہ اند

زمانے کے تقاضوں نے اسے تازہ جذبات دئے ہیں. اس کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں. اگر اس وقت اس کے سامنے زندگی کے حقائق نہ آئے' تو وہ بھی' مغرب کی طرح غلط راستے پر چل نکلے گا اور کاروانِ انسانیت اپنی منزل سے دُور ہٹتا چلا جائے گا. لہٰذا وقت کی شدید ضرورت یہ ہے کہ اس کی راہ نمائی صحیح راستے کی طرف کی جائے اور اس کے لئے

جُز تو اے دانائے اسرارِ فرنگ
کس نکو ننشست در نارِ فرنگ

باش مانندِ خلیل اللہ مست
ہر کہن بُت خانہ را باید شکست

تجھ سے زیادہ کوئی شخص موزوں نہیں ہوسکتا۔ تُو اہلِ مغرب کے راز ہائے درونِ پردہ سے واقف ہے۔ تُو نے ان کے الحاد زدہ ماحول اور بے دینی سے معمور فضا میں کافی وقت گزارا ہے۔ لیکن اس سے قطعاً متاثر نہیں ہوا۔ تُو آتشکدۂ فرنگ سے "گلزارِ ابراہیمؑ" بن کر نکلا ہے۔ اس لئے یہ فریضۂ خلیلی تمہارے ہی ذمے ہے کہ باطل تصوّرات کے بتوں کو ایک ایک کرکے توڑ دو۔ اس میں صرف مغرب کے جدید باطل تصوّرات ہی شامل نہیں، بلکہ "ہر کہن بُت خانہ" کے بتوں کا توڑنا بھی ضروری ہے۔ جو باطل تصوّرات ہمارے ہاں صدیوں سے مروّج چلے آرہے ہیں، ان کی تردید بھی لاینفک ہے۔ تم اٹھو اور یہ کام کرو۔

اس کے بعد پیر رومیؒ، اقبالؒ سے کہتے ہیں کہ:

اُمّتاں را زندگی، جذبِ دروں
کم نظر ایں جذب را گوید جنوں
ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد
بے جنونِ ذو فنوں کارے نکرد

جنونِ ذُو فنون

قوموں کی زندگی کا راز، ان ابدی اور غیر متغیّر اصولوں پر یقینِ محکم میں پوشیدہ ہے جو وحی کی رُو سے ملتے ہیں۔ سطح بین انسان، جو نہ ان اصولوں کی محکمیت سے واقف ہیں اور نہ ہی اس حقیقت سے آشنا کہ ایسے اصولوں پر ایمان، افراد اور اقوام کو کس قدر بے پناہ توانائیں عطا کر دیتا ہے، اسے دیوانہ پن سے تعبیر کرتے ہیں — ایک ایسے شخص کے نزدیک، جو آبرو کی قدر و قیمت پر ایمان نہیں رکھتا، کسی شخص کا آبرو کی حفاظت کے لئے جان دے دینا، پاگل پن قرار پاتا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ یہ شخص اتنی سی بات کے لئے جان تک کیوں قربان کر رہا ہے۔ وہ جان ہی نہیں سکتا کہ اس سے اسے کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لئے وہ اِسے دیوانگی قرار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اس قسم کے اصولوں پر یقینِ محکم کے بغیر کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کر سکتی۔

اقبالؒ نے یہاں اس قسم کے "جنون" کے لئے "ذو فنون" ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اس "جنون" کو منفرد بنا دیتی ہے۔ عام جنون کہتے ہی اسے ہیں جس میں عقل یکسر ماؤف ہو جائے۔ عقل اور جنون دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ لیکن قرآن کی رُو سے دین نام ہے ایمان اور عقل کے امتزاج کا۔ یعنی جب انسانی عقل وحی کی روشنی میں سفرِ حیات طے کرتی ہے تو انسان

منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے ـــ اقبالؒ خود اسے "عشق را با زیرکی آمیختن" کہتا ہے۔
قرآنِ کریم نے بھی جنت (بلکہ جنّتیں) کو ذَوَاتَآ اَفۡنَانٍ (۵۵/۴۸) کہا ہے۔ یعنی "ذوفنون" جس میں علوم و فنون کی مختلف شاخیں سرسبز و شاداب رہیں۔ قرآنی حقائق پر ایمان کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اس معاشرہ میں مختلف علوم و فنون، دن بدن ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ان علوم و فنون کے ماحصل کو خدا کی متعین کردہ حدود کے مطابق نوعِ انسان کی عالمگیر نشو و نما کے لئے صرف کیا جاتا ہے۔
اس کے بعد رومیؒ نے کہا ہے کہ

مومن از عـزم و توکّل قاہر است
گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

عزم و توکّل

مومن کی قوّت کا راز عزم اور توکّل میں ہے۔ اگر اس میں یہ دو جوہر نہیں تو وہ مومن نہیں، کافر ہے۔ توکّل سے مفہوم ہے قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر مکمل یقین ـــ یعنی اس حقیقت پر کُلّی یقین کہ قرآنِ کریم کا جو دعویٰ ہے کہ ان قوانین پر عمل کرنے کا یہ نتیجہ مرتب ہوگا اور ان کی خلاف ورزی کے عواقب یہ ہوں گے، وہ دعویٰ حرفاً حرفاً صحیح ہے اور اس میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔ یہ ہے توکّل ـــ دوسرا جوہر ہے عزم۔
ایک چیز ہوتی ہے نصب العین کا تعین، اور دوسری چیز ہے اس نصب العین کے حصول کا پختہ ارادہ۔ اسی کو قرآن، ایمان اور عملِ صالح سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہی دو جوہر ہیں جنہیں اقبالؒ نے (رومیؒ کی زبان میں) توکّل اور عزم کہہ کر پکارا ہے ـــ یقینِ محکم اور عملِ پیہم۔ عزم اور توکّل کی اصطلاحات، اس آیت سے لی گئی ہیں جس میں نبیٔ اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ‌ۚ تم ان سے معاملات میں مشورہ کیا کرو۔ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ‌ؕ (۳/۱۵۸) پھر جب ایک نتیجہ پر پہنچ کر عزم کر لو تو قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر بھروسہ کرتے ہوئے کام شروع کردو۔
اس کے بعد ہے۔

خیـر را او باز می داند ز شـر
از نگاہش عالمے زیر و زبر

انسان کے لئے سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ خیر (GOOD) کیا ہے اور شر (EVIL)

خیر و شر

کیا۔ اس مسئلہ کا حل، عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف وحی بتا سکتی ہے۔ اس لئے جب مردِ مومن، وحی کی روشنی کو اپنا راہ نما بنا لیتا ہے، تو اس کے سامنے خیر اور شر ایک دوسرے سے الگ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور دنیا نے، تنہا عقل کی رُو سے خیر اور شر کے جو فیصلے کر رکھے ہیں وہ الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔

کوہسار از ضربتِ اُو ریز ریز
در گریبانش ہزاراں رستخیز

مستقل اقدار پر ایمان اور خیر و شر کے ابدی معیار کے متعلق یقینِ کامل سے، مردِ مومن کے اندر ایسی بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جس سے مخالفتوں کے پہاڑ، ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ اور چونکہ اسے باطل کی ہر قوت کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس کی زندگی ایک مستقل جہاد اور کشمکشِ پیہم کی رزمگاہ ہوتی ہے۔ اس اصولی تلقین کے بعد، پیر رومیؒ، اقبالؒ سے کہتے ہیں کہ

تا مے از میخانۂ من خوردۂ
کہنگی را از تماشا بردۂ
در چمن زی مثلِ بو مستور و فاش
درمیانِ رنگ پاک، از رنگ باش

چونکہ تم نے میری فکر و جذب سے اپنے آپ کو متأثر کیا ہے اور اس طرح تقلید اور قدامت پرستی کے تمام پردے تمہاری نگاہوں سے اُٹھ چکے ہیں۔ اور حقائق بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آگئے ہیں۔ اس لئے اب تمہیں ایک نئے انداز کی زندگی بسر کرنی ہوگی۔ یعنی دنیا میں رہتے ہوئے، دنیاوی آلائشوں سے پاک اور صاف زندگی ـــ ایسے جوہروں کی حامل زندگی جو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں لیکن جن سے پوری دنیا متأثر ہو جائے۔

عصرِ تو از رمزِ جاں آگاہ نیست
دینِ او جُز حُبِّ غیر اللہ نیست

یورپ کی مادہ پرستی

یورپ کا مادہ پرست، انسانی زندگی کو محض طبیعی زندگی سمجھتا ہے اور انسانی ذات سے جو اصلِ حیات ہے، ناآشنا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی

زندگی کے کسی شعبے میں بھی وحی کی جھلک نظر نہیں آتی. اگر انسانی ذات سے انکار کر دیا جائے تو مقصدِ حیات صرف مادّی کامرانیاں رہ جاتا ہے. خواہ انہیں کسی طریق سے حاصل کر لیا جائے.

فلسفی ایں رمز کم فہمیدہ است
فکرِ اُو بر آب و گِل پیچیدہ است

جو فلسفہ، زندگی کے اس تصور پر مبنی ہوگا، وہ انسانی ذات سے متعلق کوائف کو کیا سمجھ سکتا ہے؛ وہ حیوانی سطحِ زندگی سے آگے جا ہی نہیں سکتا.

دیدہ از قندیلِ دل روشن نکرد
پس ندید اِلّا کبود و سرخ و زرد

اس نے وحی کی روشنی سے اپنی آنکھوں کو منوّر ہی نہیں کیا. اور جن آنکھوں کا یہ عالم ہو وہ مادّی چار دیواری سے آگے کچھ دیکھ ہی نہیں سکتیں.

اے خوش آں مردے کہ دل باکس نداد
بندِ غیر اللہ را از پا کشاد

ایسے خدا فراموش دَور میں وہ مردِ مومن از بس غنیمت ہے جو حدود اللہ کے سوا ہر قسم کے طوق و سلاسل توڑ ڈالے اور باطل کی کوئی جاذبیت اُسے اپنی طرف کھینچ نہ سکے.

صحبتِ کم نظراں

اقبالؒ کو اس مقصدِ جلیل کے لئے تیار کرنے کے بعد پیر رومیؒ ایک احتیاط ضروری سمجھتے ہیں اور اس سے یوں آگاہ کرتے ہیں کہ

سِرِّ شیری را نہ فہمد گاو و میش
جُز بہ شیراں کم بگو اسرارِ خویش

جو پیغام تم لے کر اُٹھے ہو، وہ بڑی جرأت، اور حوصلہ مندی چاہتا ہے. ہر شخص کا ایسا جگر نہیں ہوگا کہ اسے سُن اور سمجھ سکے. شیروں کی باتیں اگائے بھینس اور بھیڑ بکری کی سمجھ میں نہیں آیا کرتیں. اس لئے اس راز کو ہر ایک کے سامنے نہ کھولنا.

با حریفِ سفلہ نتواں خوردمے
گرچہ باشد پادشاہِ رُوم و رَے

یاد رکھو! لوگوں کو اپنا ہمدم و ندیم سوچ سمجھ اور دیکھ پرکھ کر بنانا۔ کمینہ خصلت لوگ، خواہ وہ دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے کتنے ہی اونچے کیوں نہ ہوں، اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں شریکِ محفل کرلیا جائے.

یوسفِ ما را اگر گرگے برد
بہ کہ مردے ناکسے او را خرد

ہمارے یوسف کو اگر بھیڑیا کھا جائے تو یہ اس سے کہیں اچھا ہے کہ اسے کوئی ایسا آدمی خرید کرلے جائے جو اس کی قدر و قیمت نہ پہچانتا ہو۔ ہمارا جوہر ضائع ہو جائے تو اس کا اتنا غم نہیں، جتنا غم اس کا ہے وہ کسی ناقدر شناس کے ہاتھوں میں آجائے. اس سے محتاط رہنا ضروری ہے۔ صاحبِ زر طبقہ بڑی کوشش کرے گا کہ تمہیں خرید لے، اس سے بچ کر رہنا۔ مرتے مر جانا، ان کی منڈی میں نہ پہنچنا.

اہلِ دنیا بے تخیّل، بے قیاس
بوریا بافانِ اطلس ناشناس

یہ لوگ جنہیں نہ خیالات کی بلندی حاصل ہے، نہ فکر کی گہرائی میسّر۔ یہ کیا جانیں کہ تم کس مقام سے بات کرتے ہو. یہ بوریا بُننے والے حریر و اطلس کی قدر کیا پہچانیں!

اعجمی مردے چہ خوش شعرے سرود
سوزد از تاثیرِ اُو جاں در وجود

اس عجمی مفکّر نے کتنی پتے کی بات کہی ہے جس کی تاثیر سے جسم کے اندر جان تک میں سوز پیدا ہو جاتا ہے.

اس کے بعد مثنوی میں، اس عجمی مفکّر کا جو قول نقل کیا گیا ہے، اس کا انداز اگرچہ شعر کا سا ہے. لیکن ہے وہ دراصل نثر۔ یعنی

"نالۂ عاشق بگوشِ مردمِ دنیا
بانگِ مسلمانی و دیارِ فرنگ است"

اہلِ دنیا کے کانوں میں، عاشق کی آہ و فغاں کی آواز۔ بس یوں سمجھو جیسے کفرستانِ فرنگ میں جاکر کوئی اذان دے دے۔ وہ لوگ اس آواز کو کیا پہچانیں گے!

○

اس کے بعد پیر رومیؒ، اقبالؒ کو مثبت پیغام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

معنئ دین و سیاست باز گوے
اہلِ حق را زیں دو حکمت باز گوے

دین و سیاست

مسلمان دین کی حقیقت کو فراموش کر چکا ہے۔ وہ قطعاً بھول چکا ہے کہ دین اور سیاست کا باہمی تعلق کیا ہے۔ وہ دین کو، مذہب کی سطح پر لے جا چکا ہے۔ جس سے سیاست کو کوئی تعلق نہیں ہوتا اور سیاست کو سیکولرازم کے دائرے میں مقیّد کر دیا ہے۔ جس تک دین کی رسائی نہیں ہوتی۔ انہیں بتاؤ کہ جب سیاست، حدود اللہ کے اندر رہتی ہے تو اسے دین کہا جاتا ہے۔

لیکن یہ راستہ پھولوں کی سیج نہیں۔ اس میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اس راہ میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ انہیں ہمت سے برداشت کرنا۔

"غم خور و نانِ غم افزایاں مخور
زانکہ عاقل غم خورد کودک شکر"

(یہ خود مولانا رومؒ کا شعر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ) مصیبتیں برداشت کر لینا لیکن ان لوگوں کی روٹی نہ کھانا جن کا کام ہی دوسروں کے غم میں اضافہ کرنا ہے۔ جو غریبوں کا خون چوستا ہے اس کے ہاں سے کچھ نہ لینا۔ عقلمند انسان غم کھاتا ہے اور بچے میٹھے کے پیچھے لپکتے ہیں۔

سادہ زندگی

خرقہ خود بار است بر دوشِ فقیر
چوں صبا جز بوئے گل ساماں مگیر

اس کا علاج یہ ہے کہ اپنی ضروریات کو کم سے کم حد تک سمٹا لینا۔ بڑی سادہ زندگی بسر کرنا۔ فقیر کے پاس ایک گدڑی ہوتی ہے۔ اور وہ بھی اس کے لئے بارِ دوش ہوتی ہے۔ تمہارا سازو سامانِ زندگی، تمہاری فکر اور جوہرِ ادراک ہونا چاہیئے تاکہ تم جہاں جاؤ وہ غیر مرئی طور پر تمہارے ساتھ رہے اور ساری دنیا اس سے فیضیاب ہوتی رہے۔

قلزمی؟ باد شت و در بیہم ستیز
شبنمی؟ خود را بہ گلبرگے بریز

اس کا کبھی خیال نہ کرنا کہ دنیا میں تمہاری پوزیشن کیا ہے! تم جس پوزیشن میں بھی ہو اپنے مشن کو جاری رکھو۔ اگر تمہیں ایسی قوت میسر آجائے جس سے طوفان جیسی تلاطم خیزیاں برپا ہو سکیں تو اربابِ قہر و استبداد سے

ٹکرّ لینا۔ اور اگر اس انداز کا ساز و سامان میسّر نہ آسکے تو کمزوروں اور ناتوانوں کے زخم کا مرہم بن جانا۔

سرِّ حق، بر مردِ حق پوشیدہ نیست
رُوحِ مومن ہیچ می دانی کہ چیست

روحِ مومن کی حقیقت

آؤ تمہیں بتاؤں کہ مومن کی زندگی کیا ہے اور اس کی اصلِ حیات کس قسم کی ہے۔ یہ ایک مستور حقیقت ہے۔ لیکن مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ اور یہی وہ راز ہے جسے میں تم پر واشگاف کرنا چاہتا ہوں۔ اسے ایک تشبیہ سے سمجھو۔

قطرۂ شبنم کہ از ذوقِ نمود
عقدۂ خود را بدستِ خود کشود

یوں سمجھو کہ شبنم کا ایک قطرہ، ذوقِ نمود سے، ابھرا اور اس نے کسی کا محتاج ہوئے بغیر اپنی مشکل کا حل خود دریافت کیا۔

از خودی اندر ضمیرِ خود نشست
رختِ خویش از خلوتِ افلاک بست

وہ بادلوں کی شکل (ابخرات کی صورت) میں تھا، تو اس کا الگ وجود نہیں تھا۔ اس نے تربیتِ خویش سے اپنے آپ کو مستحکم کیا اور اس طرح اس کی جداگانہ ہستی وجود میں آگئی۔ اس کے بعد وہ آسمانوں کے خلوت کدہ سے زمین کی ہنگامہ آرائیوں کی طرف آگیا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد اس نے

رُخ سوئے دریائے بے پایاں نہ کرد
خویشتن را در صدف پنہاں نہ کرد

اپنا رُخ، دریائے ناپیداکنار کی طرف نہیں کیا تاکہ اس کی جداگانہ ہستی سمندر میں گم نہ ہو جائے۔ اس نے آغوشِ صدف تک میں بھی پنہاں ہونا گوارا نہ کیا بلکہ

اندر آغوشِ سحر یک دم تپید
تا بکامِ غنچۂ نورس چکید

اس نے آغوشِ سحر میں ذرا دم لے کر تھوڑی سی حرارت اپنے اندر پیدا کی۔ اور اس کے بعد غنچۂ ناشگفتہ پر ٹپک کر اسے شاداب پھول میں تبدیل کر دیا۔

یہ ہے مومن کی زندگی۔ اپنی جداگانہ ہستی کا استحکام اور مقصد اس سے یہ کہ یہ دوسروں کے کام آجائے۔
اس شعر پر "تمہید" کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں، ایک نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

وحدتِ وجود اور اقبالؒ

پیر رومیؒ وحدت الوجود کا قائل ہے۔ وحدت الوجود کا منتہیٰ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی جداگانہ ہستی کو ذاتِ باری تعالیٰ میں فنا کر دے۔ یہ، اصل سے الگ شدہ ذات، پھر سے اپنی اصل میں جا کر مل جائے۔ واصل بالحق ہوجائے۔ یہی اس کی انتہائی کامرانی ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اس کے برعکس، اقبالؒ کا فلسفۂ خودی یہ ہے کہ انسان اپنی منفرد جداگانہ ہستی کو کہیں بھی فنا نہ کرے۔ حتیٰ کہ (اس کا پیغام یہ ہے کہ)

بخود محکم گزار اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحرِ نورش

دوسرے مقام پر ہے — بہ بحرش گم شدن انجامِ ما نیست۔ اسی حقیقت کو انہوں نے "قطرۂ شبنم" کی مثال میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

رُخ سُوئے دریائے بے پایاں نہ کرد

اقبالؒ کے فلسفہ کی یہی اصل و بنیاد ہے۔ اس کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ اقبالؒ کے متعلق یہ کیسے کہا جائے کہ وہ وحدت الوجود کا قائل تھا۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے کہ اسے رومیؒ کا جوش و خروش پسند آگیا ہے، ورنہ رومیؒ اور اقبالؒ کی منزلیں بالکل الگ الگ ہیں۔

باب نمبر ۳

خطاب بہ مہرِ عالمتاب

اس مثنوی کی تمہید سامنے آچکی ہے. اس میں بتایا گیا ہے کہ مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مستحکم اور منفرد رکھے اور دوسروں کے لئے کشودِ کار اور کشادِ ذات کا موجب بنے. اب اس سے اگلا باب ہمارے سامنے آتا ہے. جس کا عنوان ہے ــــ خطاب بہ مہرِ عالمتاب.

اقبالؒ جہاں عقل و عشق، ذکر و فکر، خبر و نظر وغیرہ کا تقابل کرتا ہے وہاں شرق و غرب کو بھی ایک دوسرے کے سامنے لاتا ہے. اس سے اس کی مراد، دو ممالک کا باہمی مقابلہ نہیں، بلکہ زندگی کے دو متضاد نظریات و تصوّرات کا تقابل ہے. اس میں شبہ نہیں کہ جیسا کہ قرآنِ کریم نے بتایا ہے، دنیا کی ہر قوم کی طرف خدا کے پیغامبر آتے رہے، لیکن تاریخ نے جن بڑے بڑے مذاہب کا ذکر کیا ہے، ان کا آغاز مشرق میں ہوا. اور مغرب اپنی جس تہذیب کی رُو سے دنیا میں متعارف و ممتاز ہوا ہے، اس کی بنیاد (وحی کے برعکس) مادیت پر ہے. اس لئے اقبالؒ جب شرق و غرب کا مقابلہ کرتا ہے تو اس کے پیشِ نظر، وحی اور "عقلِ بیباک" (مغرب کی مادیت) کا تقابل ہوتا ہے. اسی جہت سے وہ مہرِ عالمتاب کو "امیرِ خاور" (مشرق کا سردار) کہہ کر پکارتا ہے اور اس سے ملتجی ہے کہ وہ صفحۂ ارض کو اپنی ضیا پاشیوں سے معمور کر دے. اس باب میں جو کچھ مہرِ عالمتاب سے کہا گیا ہے اسے وحی کی روشنی سے متعلق سمجھنا چاہیئے. پہلا شعر ہے

اے امیرِ خاور اے مہرِ منیر
می کنی ہر ذرّہ را روشن ضمیر

اے سردارِ مشرق! اے آفتابِ عالمتاب! تو ہر ذرّہ کے ضمیر کو روشنی عطا کرتا ہے. ہر پیکرِ خاکی (انسان) تجھ سے راہ نمائی حاصل کرتا ہے.

از تو ایں سوز و سرور اندر وجود
از تو ہر پوشیدہ را ذوقِ نمود

ہر انسان کے دل میں زندگی کی حرارت تیری وجہ سے ہے. ہر ایک کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما تیری رہینِ منت ہے (غور کیجئے، وحی کی، سورج کے ساتھ تشبیہ، کس قدر تام ہے).

می رود روشن تر از دستِ کلیم
زورقِ زرّینِ تو در جوئے سیم

اس فضائے نیلگوں میں تو اس طرح محوِ خرام رہتا ہے جس طرح چاندی کی ندی میں، سونے کی کشتی بہے چلی جا رہی ہو. ایسی کشتی جس کی درخشندگی، جناب کلیمؑ اللہ کے یدِ بیضا سے بھی زیادہ تابناک ہے. (یہاں اشارہ قرآنِ کریم کی طرف ہے. اسی وجہ سے اس کی روشنی کو یدِ بیضا سے بھی زیادہ تابناک کہا گیا ہے).

پرتوِ تو ماہ را مہتاب داد
لعل را اندر دلِ سنگ آب داد

چاند پر تیرا عکس پڑتا ہے تو وہ مہتاب بن جاتا ہے. دوسری طرف، پتھر کا ٹکڑا، جب تیری حرارت کو اپنے اندر مرتکز کرتا ہے تو لعلِ درخشندہ ہو جاتا ہے.

اگر آپ اس تیرہ سو سال کی تاریخ کا صحیح نظروں سے مطالعہ کریں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ دنیا میں جہاں جہاں شرفِ انسانیت کی کوئی کرن، اور زندگی کی حرارت کی کوئی رمق نظر آتی ہے، وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ، قرآنی تعلیم ہی کا پرتو ہے. اسی حقیقت کو اقبالؒ نے دوسرے مقام پر ان بلند اور حسین ترین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
زانکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفٰےؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفٰےؐ است

اس سے اگلے دو شعروں میں بھی آفتاب کی اسی خصوصیت کی مزید وضاحت کی گئی ہے کہ کائنات کی ہر شے میں نور و حرارت، اسی کے فیضان کا اثر ہے.

لالہ را سوزِ دروں از فیضِ تست
در رگِ اُو موجِ خوں از فیضِ تست

گلِ لالہ کا "شعلۂ پنہاں" اور اس کے "خون کی رنگینی" تیرے ہی فیض سے ہے. (یوں تو ہماری شاعری میں۔ بلکہ اور ممالک کی شاعری میں بھی ۔ لالہ کو شعلہ صفت قرار دیا گیا ہے، لیکن اقبالؒ کے ہاں اس کا ذکر بڑی کثرت سے آتا ہے) وہ عشق کے سوزِ دروں اور زندگی کی حرارت کو بالعموم لالہ سے تعبیر کرتے ہیں.

نرگساں صد پردہ را بر می درد
تا نصیبے از شعاعِ تو برد

لالہ اگر جلال کا مظہر ہے، تو شاعری میں نرگس، پیکرِ جمال ہے. اُس سے اگر سوز و حرارت کی تعبیر کی جاتی ہے تو اس سے نور و بصیرت کی تفسیر. لالہ اپنا سینہ شق کرکے، آفتاب کی حرارت اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، تو نرگس ہزاروں پردے چاک کرکے اس کی روشنی کو اپنے لئے سرمۂ چشم بنالیتی ہے ۔ دنیا میں علم کا نور اور عمل کی حرارت، سب وحی کے فیض سے ہے.

آفتابِ عالمتاب کی ان خصوصیات کو بیان کرنے کے بعد، علامہ اس کا استقبال ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ

خوش بیا صبحِ مراد آوردۂ
ہر شجر را نخلِ سینا کردۂ

تم آؤ. میرا دیدہ و دل تمہارے لئے فرشِ راہ ہے. تمہارے جلو میں مرادبں بھری صبح عروسانہ شان سے آتی ہے. تمہارے نور سے اس چمن کا ہر درخت، شجرِ طور بن جاتا ہے جو تجلّیاتِ خداوندی کا مظہر ہوتا ہے. ذرا غور کیجئے. جب ایک شخص قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اس وقت گویا خدا اس سے ہمکلام ہوتا ہے. اس لئے کہ قرآن، خدا کا کلام ہے. اور جس سینے میں قرآن کی تعلیم اُتر جاتی ہے، وہ تجلّیاتِ خداوندی سے معمور ہو جاتا ہے. یاد رکھئے! آپ خدا سے "ہمکلام" ہونے اور اس کی تجلّیات کا نظارہ کرنے سے مراد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان، خدا کی کتاب (قرآن) پر غور کرے اور اس کے مطابق عمل کرے.

اس کے بعد اقبالؒ، وحی کے حضور اپنی عرضداشت پیش کرتا ہے ۔ اور دیکھئے کہ کس حسن و خوبی سے

پیش کرتا ہے۔

تو فروغِ صبح و من پایانِ روز
در ضمیرِ من چراغے بر فروز

تُو تمام دنیا سے تاریکیاں دُور کرکے اسے بقعۂ نور بنا دیتا ہے۔ اور میری زندگی شام کی تاریکی سے مشابہ ہے۔ میری التجا یہ ہے کہ تو میرے قلب میں ایسا چراغ روشن کردے جس سے یہ زندگی سراپا نور بن جائے۔

تیرہ خاکم را سراپا نور کن
در تجلّی ہائے خود مستور کن

اس طرح سراپا نُور بن جائے کہ میں تیری تجلّیات کے اندر مستور ہوجاؤں۔ یہ مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں۔

تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق
بر فروزم سینۂ احرارِ شرق

تاکہ میں اہلِ مشرق کے تصوّرات، نظریات، خیالات، عقائد و افکار کو جو اس وقت یکسر تاریک ہیں، روشن کرسکوں اور جو لوگ آزاد زندگی بسر کرنے کے آرزومند ہیں ان کے سینے کو اس روشنی سے تابناک بنا سکوں۔

از نوائے پختہ سازم خام را
گردشِ دیگر دہم ایّام را

میں اپنی آواز سے، ان کے خام خیالات میں پختگی پیدا کرتا جاؤں اور اس طرح تاریخ میں ایک ایسا انقلاب برپا کردوں جس کا چشمِ فلک کو صدیوں سے انتظار ہے۔ یعنی یہاں صحیح قرآنی معاشرہ تشکل ہوجائے۔

فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ
از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

اس وقت کیفیت یہ ہے کہ اہلِ مشرق یورپ کے مادہ پرستانہ افکار و تصوّرات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ انہیں اس غلامی سے آزاد کیا جائے ـــ یہ حصّۂ لآ ہوگا۔ یعنی ذہن کو غیر قرآنی تصوّرات سے پاک کرنا۔ اس کے بعد وہ میرے پیغامات سے، جنہیں میں قرآن سے اخذ کرتا ہوں، نیا آب و رنگ حاصل کریں گے۔ یہ اِلّآ کی منزل ہوگی۔ جب تک یہ نہیں ہوگا، مشرق صحیح آزادی حاصل نہیں کرسکے گا، اس لئے کہ

زندگی از گرمیٔ ذکر است و بس
حریّت از عفّتِ فکر است و بس

آزادی اس کا نام نہیں کہ قوم اپنی حکومت آپ قائم کرے۔ اس کی مملکت خود مختار ہو۔ صحیح آزادی یہ ہے کہ اس قوم کا ذہن غیروں کے افکار و تخیّلات سے پاک ہو۔ اصل زنجیریں جن کے توڑنے کا نام آزادی ہے، وہ ہوتی ہیں جن میں کسی قوم کا ذہن مقیّد ہوتا ہے۔ جب تک وہ نہیں ٹوٹتیں، قوم آزاد نہیں ہو سکتی۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ یہ ہے کہ وحی کی روشنی میں اس قوم کے قوائے عملیہ میں حرارتِ نو پیدا کی جائے — قوموں کی آزادی کے لئے تطہیرِ فکر اور گرمیٔ ذکر دونوں ازبس ضروری ہیں۔

چوں شود اندیشۂ قومے خراب
ناسَرہ گردد بدستش سیمِ ناب

اگر کسی قوم کے افکار و تخیّلات، عقائد و نظریات خراب ہو جائیں تو اس کے ہاتھوں میں خالص چاندی بھی کھوٹا سکّہ بن جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ قوموں کی زندگی کے لئے سامانِ زیست کے ذرائع لاینفک ہیں۔ جس قوم کی معاشی حالت درست نہیں وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن معاشی حالت بھی اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے جب اس قوم کے نظریاتِ زندگی صحیح ہوں۔ اگر اس کا ذہن غلام ہے، تو اس کے ذرائع پیداوار بھی اسے خوشحالی اور فارغ البالی عطا نہیں کر سکتے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر اقبالؒ نے کہا تھا کہ

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اس کا زوال، ان غلط معتقدات اور غیر قرآنی تصورات کی وجہ سے ہے جو صدیوں سے اس کے قلب و دماغ کو تاریکیوں میں رکھے ہوتے ہیں۔ جب کوئی قوم اس قسم کے غلط خیالات کی حامل بن جائے تو

میرد اندر سینہ اش قلبِ سلیم
در نگاہِ اُو کج آید مستقیم

اس میں اس امر کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی کہ وہ زندگی کی مستقل اقدار کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ اس کے برعکس اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر ٹیڑھی چیز اسے سیدھی نظر آتی ہے۔ ہر عیب اس کی نگاہ میں ہنر بن جاتا ہے۔ ہر برائی اسے بھلائی بن کر دکھائی دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

برکراں از حرب و ضربِ کائنات
چشمِ اُو اندر سکوں بیند حیات

دوسری قومیں کارزارِ حیات میں سرگرمِ عمل ہوتی ہیں اور یہ گہری نیند سو رہی ہوتی ہے۔ وہ دریا کی تلاطم خیزیوں میں نبردآزما ہوتی ہیں اور یہ لبِ ساحل محوِ تماشا ہوتی ہے۔ عمل کا تصوّر اُسے موت بن کر ڈراتا ہے۔ یہ بے عملی کی ساکت و صامت زندگی ہی کو عین حیات سمجھتی ہے۔

نتیجہ اس کا یہ کہ

موج از دریاش کم گردد بلند
گوہرِ اُو چوں خزف نا ارجمند

اس کی زندگی میں قوّت اور حرارت کی کوئی نمود نہیں ہوتی۔ اس کے دریائے ہستی سے کوئی موج اٹھتی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ دریا کیا' ایک جوہڑ ہوتا ہے جس میں عدمِ حرکت سے کچھ عرصے کے بعد سخت تعفّن پیدا ہو جاتا ہے۔ قوموں کے بازارِ بیع و شریٰ میں اس کی بے وقعتی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے ہاں کا کوئی موتی بھی پیش کرے تو کوئی اسے کوڑیوں کے دام نہیں خریدتا۔ اس منڈی میں اس جنسِ کاسد کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔

حضرت علامہؒ نے یہ مثنوی تشکیلِ پاکستان سے دس بارہ سال قبل لکھی تھی۔ اس وقت انہوں نے پاکستان کا تصوّر تو پیش کر دیا تھا، لیکن اس کا عملی امکان کہیں نظر نہیں آتا تھا — اگرچہ ان کی نگہِ دُوررس نے "ہندی مسلمان" کو ایک "بہشتے فی سبیل اللہ" کا پیغام دے دیا تھا — ان کی وفات کے قریب نو سال بعد پاکستان وجود میں آیا۔ اور اسے وجود میں آئے اب پندرہ سال کا عرصہ ہو گیا[1]۔ حضرت علامہؒ نے جو کچھ اس مثنوی میں کہا ہے یوں نظر آتا ہے جیسے انہوں نے پاکستان کی زندگی کا پورا پورا مطالعہ کر کے سارا نقشہ ہمارے سامنے کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ قرآن پر تدبّر' انسان کو اس قسم کی بصیرت عطا کر دیتا ہے۔ جس سے وہ یہ کہنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

سوال یہ ہے کہ جب کوئی قوم ایسے حالات میں گھر جائے تو اسے کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے حضرت علامہؒ پورا پروگرام ایک شعر میں مرتّب کر دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ

---

[1] یاد رہے کہ پرویزؒ صاحب نے یہ شرح ۱۹۶۲ء میں کی تھی

پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

اس قوم کو چاہیئے کہ سب سے پہلے اپنے خیالات، نظریات، تصورات، معتقدات کو غیر قرآنی آمیزش سے پاک کرے۔ یعنی لَا اِلٰہ پر پورا پورا عمل کرے۔ جب وہ کعبۂ فکر و نظر کو باطل کے بتوں سے پاک کرلے گی تو پھر اس میں صحیح قرآنی فکر پیدا کرنا آسان ہوگا۔ اگر پہلے قلب و نظر کی تطہیر نہیں کی جائے گی تو ان کی کوئی تعمیری کوشش نتیجہ خیز نہیں ہوگی۔ قوموں کی یہ تطہیرِ فکر صحیح تعلیم سے ہوتی ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم نے سب سے پہلے اس بات پر زور دیا تھا کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم، قرآنی انداز کے مطابق کریں۔ اس پر کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم اپنی پکار کو برابر دہراتے رہے، لیکن قوم نے اس کا کوئی خیال نہ کیا۔ اس کا جو نتیجہ ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

اس کے بعد بھی ہماری حالت کبھی سنبھل نہیں سکے گی، جب تک ہم اپنی فکر کو غیر قرآنی تصورات سے آزاد نہیں کریں گے۔ ان غیر قرآنی تصورات میں مغرب کے افکارِ باطل بھی شامل ہیں، اور ہمارے وہ مروّجہ غلط معتقدات بھی جنہوں نے بدقسمتی سے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اس کے سوا ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

پس نخستیں بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیرِ فکر

یہ اس باب کا آخری شعر ہے۔

باب نمبر ۴

حکمتِ کلیمی

"خطاب بہ مہرِ عالمتاب" کا عنوان سامنے آچکا ہے، جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ نوعِ انسان کے لئے نجات وسعادت کی راہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے معاملات کا حل وحی کی روشنی میں تلاش کرے۔ اور وحی سے استفادہ کی شرطِ اوّلیں یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن سے، غیر قرآنی خیالات اور تصوّرات کو نکال دے۔ اس کے بعد دو عنوانات میں، قرآنی نظامِ زندگی اور غیر قرآنی نظام کا تقابل ہے۔ اوّل الذکر کو حکمتِ کلیمی سے تعبیر کیا گیا ہے اور آخر الذّکر کو حکمتِ فرعونی سے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں حق و باطل کی کشمکش، اسی دن سے جاری ہے جس دن خدا کی طرف سے سلسلۂ ہدایت شروع ہوا، لیکن صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی باہمی آویزش اس کشمکش کی بڑی تفصیلی داستان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اس کا تذکرہ مختلف مقامات پر کیا ہے۔

نظامِ خداوندی کی مخالفت ہمیشہ مفاد پرست طبقات کی طرف سے ہوئی ہے۔ یہ طبقات بہ ہیئتِ مجموعی تین شعبوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں — ملوکیّت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت۔ حضرت موسیٰؑ کے مدِّمقابل یہ تینوں قوتیں متحدہ محاذ بنا کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ استبدادِ ملوکیّت کا مجسمہ، فرعون۔ مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ، ہامان۔ اور نظامِ سرمایہ داری کا نقیب، قارون۔ علّامہ اقبالؒ نے اسی وجہ سے، حق اور باطل کے نظام کے موازنہ کے لئے اس کشمکش کو زیبِ عنوان بنایا ہے — ایک طرف وہ نظام ہے جو وحی کے غیر متبدّل اصولوں کے مطابق قائم ہوتا ہے — دوسری طرف وہ نظام ہے جسے انسان کی مفاد پرستیاں، وجود میں لاتی ہیں۔ پہلے، نظامِ خداوندی کی خصوصیات سامنے آتی ہیں جس کا عنوان ہے۔

حکمتِ کلیمی

سلسلۂ کلام کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

تا نبوّت حکمِ حق جاری کند
پشت پا بر حُکمِ سلطاں می زند

دین کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی اختیار کی جا سکتی ہے، کسی غیرِ خداوندی قوّت کی نہیں. جملہ اقتدار و اختیار صرف خدا کے لئے ہے. لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ سے مفہوم یہی ہے. نبی کو خدا کی طرف سے احکام ملتے تھے' اور اس کا فریضہ یہ ہوتا تھا کہ وہ ان احکام کو دنیا میں عملاً نافذ کرے. اس لئے' سب سے پہلے اس کا ٹکراؤ' ملوکیت کے ساتھ ہوتا تھا — ملوکیّت سے مراد صرف بادشاہت نہیں. اس سے مراد ہر وہ نظامِ سیاست ہے جس میں غیر اللہ کے احکام جاری ہوں — وہ بادشاہت ہو یا آمریت، جمہوریت ہو یا نظامِ پیشوائیت — نبوّت' ان سب کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کرتی تھی اور انسانوں کو ہر نوعِ غلامی سے آزاد کراتی تھی. نبوّت نبیٔ اکرمؐ کے بعد ختم ہو گئی لیکن احکامِ خداوندی قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں. حضورؐ کے بعد امّتِ مسلمہ کا فریضہ تھا کہ وہ ہر غیرِ خداوندی نظام کو مٹا کر' دنیا میں احکامِ خداوندی کو نافذ کرتی. لیکن انہوں نے' خود اپنے ہاں ہر اس نظام کو رائج کر لیا جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور جسے نبیٔ اکرمؐ نے عملاً مٹا کر دکھا دیا تھا — ملوکیّت' سرمایہ داری' مذہبی پیشوائیت' ایک ایک کر کے اس اُمّت کے نظامِ زندگی کے جزو بن گئے اور اب تک بنے چلے آ رہے ہیں. نبوت' یعنی نظامِ خداوندی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

در نگاہش قصرِ سلطاں کہنہ دیر
غیرتِ اُو بر نتابد حکمِ غیر

غیرِ خداوندی نظام' اس کی نگاہوں میں ایک بُت خانہ ہوتا ہے. شرک کے معنی یہ ہیں کہ انسان' خدا کے علاوہ کسی اور کے حکم کی اطاعت کرے. نظامِ خداوندی کی غیرت اسے گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کے حکم کے سامنے گردن جھکا دے.

اس مقصد کے لئے نبی اپنی عدیم النّظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے ایک ایسی جماعت تیار کرتا ہے جو ہر

نظامِ باطل سے ٹکر لیتی ہے۔

پختہ سازد صحبتش ہر خام را
تازہ غوغائے دہد ایام را

اس کی تعلیم و تربیت، ہر ناپختہ انسان کو پختہ بنا دیتی ہے۔ اور دنیا میں ایک نئے انقلاب کی رُوح پھونک دیتی ہے۔ نبی صرف وعظ کہنے کے لئے نہیں آتا۔ وہ ایک صالح انقلاب برپا کرنے کے لئے آتا ہے۔

درسِ اُو اللہ بس باقی ہوس
تا نیفتد مردِ حق در بندِ کس

اس کی ساری تعلیم کا مقصود و منتہٰی یہ ہوتا ہے کہ حکمرانی و فرماں روائی صرف خدا کے لئے ہے۔ اس کے سوا کسی کو حقِ حکومت حاصل نہیں۔ اور اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر قسم کی غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

از نمِ او آتش اندر شاخِ تاک
در کفِ خاک از دمِ اُو جانِ پاک

اس کی تربیت سے، انگور کی زم و نازک شاخوں میں، آتشِ سیّال موجزن ہو جاتی ہے۔ کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانیت کی عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑنے لگ جاتا ہے۔ آب و گل کے پیکرِ انسان، زندگی اور حرارت کے برق پالے بن جاتے ہیں۔ عرب کی اونٹ چرانے والی اور کھجور کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والی قوم، اقوامِ عالم کی امامت کی سزاوار بن جاتی ہے۔ یہ ہوتا ہے نبی کی تعلیم و تربیت کا اثر!

معنیٔ جبریل و قرآں است اُو
فِطْرَۃُ اللّٰہ را نگہباں است اُو

وحی کی کنہ و ماہیت کو ہم جان نہیں سکتے۔ نبی کے سوا اسے کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ خدا نے کہا کہ ہماری وحی کو جبریلؑ قلبِ محمدیؐ پر نازل کرتا ہے۔ ہم اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ لیکن جب نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا کہ یہ ہے وہ قرآن جسے خدا کی طرف سے جبریل امین لے کر مجھ پر نازل ہوئے ہیں، تو ہم نے سمجھ لیا کہ وحی کسے کہتے ہیں۔

پھر، رسول کا فریضہ اتنا ہی نہیں کہ وہ خدا کی وحی لوگوں تک پہنچا دیتا ہے اور بس۔ وہ (معاذ اللہ) صرف ڈاکیہ کا کام نہیں کرتا کہ چٹھی مکتوب الیہ تک پہنچا دی اور چلا گیا۔ نبیٔ خدا کے پیغام کو دنیا میں عملاً نافذ کرتا اور اس طرح دینِ خداوندی کی نگہبانی کرتا ہے۔

حکمتش برتر ز عقلِ ذو فنوں
از ضمیرش اُمتے آید بروں

وحی کا سرچشمہ، عقلِ انسانی سے ماوراء ہوتا ہے۔ وحی، انسانی عقل و فکر کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اس میں کسب و ہنر کو دخل ہی نہیں ہوتا۔ یہ خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ البتہ ہم اس کے مطالب کو عقل و بصیرت سے سمجھ سکتے ہیں۔

نبی، اس وحی کو عام کرتا ہے، اور جو لوگ اس کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لاتے ہیں، انہیں ایک برادری کے رشتہ میں منسلک کرتا جاتا ہے۔ اس طرح وہ امت وجود میں آجاتی ہے جو وحی کے مطابق انقلاب برپا کرتی ہے۔ یاد رکھئے! امت، نبی کی نسبت سے وجود میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم، تمام انبیائے سابقہ پر ایمان رکھنے کے باوجود، جملہ امم سابقہ ـــ یہود، نصاریٰ وغیرہ سے الگ، ایک مستقل امت ہیں۔ اس امت کا فرد وہی ہوسکتا ہے جو تمام انبیائے سابقہ پر ایمان لانے کے ساتھ، محمدؐ رسول اللہ پر بھی ایمان لائے۔ جو حضورؐ پر ایمان نہیں لاتا وہ اس اُمت کا فرد نہیں ہوسکتا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص، نبیِ اکرمؐ کے بعد کسی اور کو نبی تسلیم کرتا ہے تو وہ اس (نئے) "نبی" کی اُمت کا فرد ہو جائے گا۔ امتِ محمدیہ کا فرد نہیں رہے گا ـــ بعینہٖ جس طرح ایک عیسائی جب نبیِ اکرمؐ پر ایمان لے آئے تو وہ امتِ حضرت عیسٰیؑ کا فرد نہیں رہتا، امتِ محمدیہ کا فرد ہو جاتا ہے۔

جو حکومت وحی کی رُو سے قائم ہوتی ہے، اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

حکمرانے بے نیاز از تخت و تاج
بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج

اُس میں جس شخص (یا جس ادارہ) کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار ہوتی ہے، اس کی حیثیت حاکم اور فرماں روا کی نہیں ہوتی۔ اس کی حیثیت، احکامِ خداوندی کو نافذ کرنے والے کی ہوتی ہے۔ وہ خود بھی ان احکام کی اطاعت کرتا ہے اور دوسروں سے بھی انہی احکام کی اطاعت کراتا ہے۔

دوسرے مصرعہ میں ـــ بے کلاہ و بے سپاہ و بے خراج ـــ سے یہ مطلب نہیں کہ اس حکومت میں نہ فوج ہوتی ہے نہ حکومت کی کوئی آمدنی۔ اس حکومت میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن یہ، حاکم کی منشاء کو پورا کرنے یا اس کے مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ سب قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس میں "کلاہ و سپاہ و خراج" حکمران کے لئے نہیں ہوتے۔ حکومتِ خداوندی کے لئے ہوتے ہیں۔

از نگاہش فرو دیں خیزد زوے
دُردِ ہر خُم تلخ تر گردد زمے

وہ صرف احکامِ خداوندی کو میکانکی طور پر نافذ نہیں کرتا. وہ افرادِ امت کی تربیت بھی کرتا ہے. ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتا ہے. نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کی خزاں دیدہ شاخوں پر از سرِ نو بہار آجاتی ہے اور تلچھٹ میں بھی شرابِ خالص کی سی تندی اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے. اس کی تعلیم و تربیت سے کم صلاحیتوں والے افراد بھی بلندیاں حاصل کرتے چلے جاتے ہیں.

اندر آہِ صبح گاہِ اُو حیات
تازہ از صبحِ نمودش کائنات

اس کا دلِ دردمند، نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے، راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر گریہ وزاری کرتا اور بحضور ربّ العزّت دعائیں مانگتا ہے. اس کی دردمندی اور بہی خواہی میں قوم کی زندگی کا راز پوشیدہ ہوتا ہے. حقیقت یہ ہے کہ خود اس کا ظہور پوری کائنات کو تازگی عطا کر دیتا ہے.

یہ اس کی سیرت کا جمالی پہلو ہے. دوسری طرف

بحر و بر از زورِ طوفانش خراب
از نگاہِ او پیامِ انقلاب

ظلم و استبداد کی ہر قوت، اس کے جلال و سطوت سے لرزہ براندام ہوتی ہے. وہ سیلِ رواں کی طرح اٹھتا ہے اور باطل کی ہر قوت کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے. وہ کائنات کے گوشے گوشے کو پیامِ انقلاب سے آشنا کر دیتا ہے.

درسِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ می دہد
تا دلے در سینۂ آدم نہد

وہ انسان کے سینے میں ایک زندہ اور پائندہ دل رکھ دیتا ہے، جو دنیا کی کسی قوت سے نہیں دبتا. وہ خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتا اور اس طرح ہر قسم کے خوف و حزن سے آزاد ہو جاتا ہے.

عزم و تسلیم و رضا آموزدش
در جہاں مثلِ چراغ افروزدش

وہ انسانوں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں اور اس کے بعد اپنے اندر ایسا عزمِ محکم پیدا کریں کہ یہی قوانین، تمام عالمِ انسانیت کا ضابطۂ حیات بن جائیں۔ اس طرح ان انسانوں کی سیرت و کردار اور علم و بصیرت کی روشنی سے ساری دنیا منوّر ہو جائے۔

من نمیدانم چہ افسوں می کند
رُوح را در تن دگرگوں می کند

معلوم نہیں کہ اس کی تعلیم و تربیت کیا افسوں پھونکتی ہے کہ وہ انسان کے دل کی گہرائیوں میں عظیم انقلاب پیدا کر دیتی ہے، اور اس طرح یہ افراد، کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔

صحبتِ اُو ہر خزف را دُر کند
حکمتِ اُو ہر تہی را پُر کند

اس کی صحبت سے، خزف ریزے بھی لعل و گہر بن جاتے ہیں۔ اس کی وحی پر مبنی تعلیم سے، انسانی دلوں کے خالی پیالے علم و بصیرت سے پُر ہو جاتے ہیں۔

بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز
ہر کہن معبود را کُن ریز ریز

وہ کمزور و ناتواں انسانوں کو پیغامِ انقلاب دیتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ اٹھو! اور باطل کی جن قوتوں نے انسانوں کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر رکھا ہے ان کی کمر توڑ دو۔ ان تمام بتوں کو ریزہ ریزہ کر دو۔

اس کے بعد اقبالؒ تفصیل سے بتاتا ہے کہ تعلیمِ نبویؐ بندۂ مومن کو کیا سبق دیتی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ

مردِ حق! افسونِ ایں دَیرِ کہن
از دو حرفِ رَبِّیَ الْاَعْلٰی شکن

مومن کا ایمان یہ ہے کہ ربّی الاعلیٰ۔ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف خدا کا ہے۔ کبریائی اور حکومت اسی کے لئے ہے۔ وہ سب سے بلند و بالا ہے۔ اس لئے انسانی دنیا میں فرماں روائی صرف اس کے قانون کی ہونی چاہیئے۔ یہی وہ انقلابی آواز ہے جس سے مردِ مومن باطل کے ہر علم کو توڑ دیتا ہے۔

فقر خواہی از تہیدستی منال
عافیت در حال و نے در جاہ و مال

اگر کبھی حالات نامساعد ہو جائے تو چیخنا چلّانا مت شروع کردو۔ ہمّت سے کام لو۔ یاد رکھو! امن و عافیت، مال اور مناصب سے حاصل نہیں ہوتے۔ اس کا تعلق انسان کی کیفیتِ قلب سے ہے۔ اگر اس میں صحیح نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے (جو ایمان کا فطری نتیجہ) ہے تو وہ ناسازگار حالات سے گھبراتا نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ

صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد
نے زر و سیم و قماشِ سرخ و زرد

اور دل کی کیفیت، ان صفاتِ حسنہ سے پیدا ہوتی ہے جو مومن کا شعارِ زندگی ہیں۔ یہ چیز مال و دولت سے حاصل نہیں ہوتی۔

بگذر از کاؤس و کَے اے زندہ مرد
طوفِ خود کن گردِ ایوانے مگرد

حکمرانوں کی چوکھٹ پر جبہ سائی کرنا اور اربابِ دولت کے محلّات کا طواف کرنا وجہِ ننگِ انسانیت ہے۔ تم اپنی خودی کو بیدار اور مستحکم کرو۔ ساری دنیا تمہارے سامنے جُھکے گی۔ حقیقی قوّت، سیرت اور کردار کی بلندی میں ہے۔

از مقامِ خویش دُور افتادۂ
کرگسی کم کن کہ شاہیں زادۂ

علّامہ اقبالؒ، عصرِ حاضر کے مسلمان سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو اپنے بلند و برتر مقام سے بہت دُور جا پڑا ہے۔ تو شاہین بچہ ہے۔ تیرا کام، زندہ شکار کرنا ہے۔ تو چیلوں اور گدھوں کی طرح مردہ لاشوں پر کیوں منڈلا رہا ہے۔

مرغک اندر شاخسارِ بوستاں
بر مرادِ خویش بندد آشیاں
تو کہ داری فکرتِ گردوں مسیر
خویش را از مرغکے کمتر مگیر

ایک چھوٹی سی چڑیا بھی جب باغ میں گھونسلا بنانا چاہتی ہے تو وہ اپنی منشا کے مطابق شاخِ آشیاں کا انتخاب

کرتی ہے اور پھر اپنی مرضی کے مطابق اپنا گھر بناتی ہے۔ اے مردِ مسلماں! تیری فکر تو نہ آسمان سے بھی آگے جانے والی ہے۔ تیرا مقام اس قدر بلند ہے۔ تو اپنے آپ کو اس چڑیا سے بھی کمتر سمجھ رہا ہے۔ تو غلامی اور محکومی پر ایسا رضامند ہو چکا ہے کہ تیری ساری زندگی غیروں کے اشارے کے تابع بسر ہوتی ہے۔

دیگر ایں نُہ آسماں تعمیر کُن
بر مرادِ خود جہاں تعمیر کُن

اُٹھ۔ اس جہانِ مستعار کو پھونک دے اور اپنے لئے اپنی منشاء و مقصود کے مطابق ایک نئی دنیا تعمیر کر۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

جب بندۂ مومن اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ کر لیتا ہے تو اسے اس قدر غلبہ و اقتدار حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کے فیصلے، دنیا میں خدا کے فیصلوں کی طرح نافذ اور رائج ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ فیصلہ ہی وہی کرتا ہے جو قانونِ خداوندی کا تقاضا ہوتا ہے۔

چار سوئے با فضائے نیلگوں
از ضمیرِ پاکِ او آید بروں

اس سے یہ کائنات ایک نئے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ اس کا پاکیزہ قلب، اس خارجی دنیا کو اس طرح متأثر کر دیتا ہے کہ اس میں خباثت کا نام و نشان تک نہیں رہتا۔ لٰہذا

در رضائے حق فنا شو چو سلف
گوہر خود را بروں آر از صدف

جس طرح عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے مومنین نے اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی سے یکرنگ کر لیا تھا، اسی طرح تم بھی کرو۔ اور یوں اپنی خودی کو مستحکم کر کے، گوہرِ آبدار کی طرح دنیا میں درخشندہ و تابندہ زندگی بسر کرو۔

در ظلامِ ایں جہانِ سنگ و خشت
چشمِ خود روشن کن از نورِ سرشت

اس جہانِ تیرہ و تار میں، وحی کی قندیل سے، اپنا راستہ بھی روشن کرو، اور باقی دنیا کی بھی راہبری کرو۔

تا نہ گیری از جلالِ حق نصیب
ہم نیابی از جمالِ حق نصیب

لیکن یہ یاد رکھو کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے اندر پوری پوری قوّت بیدار کرو۔ قوّت کے بغیر زندگی کی آسائشیں نصیب نہیں ہوسکتیں۔ لیکن قوّت ہو یا زندگی کی آسائشیں، یہ سب قوانینِ خداوندی کے مطابق حاصل اور صرف کرنی چاہئیں۔

ابتدائے عشق و مستی قاہری است
انتہائے عشق و مستی دلبری است

مومن کے لئے غلبہ و اقتدار نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ غلبہ و اقتدار، مقصود بالذات نہیں۔ اس سے باطل کی قوّتوں کو زیر کر کے، دنیا میں ایسا نظامِ عدل و احسان قائم کرنا مقصود ہے جس کی طرف ساری دنیا کشاں کشاں چلی آئے اور وہ تمام عالمِ انسانیت کا محبوب و مطلوب بن جائے۔

مردِ مومن از کمالاتِ وجود
از وجود و غیرِ اُو ہر شے نمود

حقیقی زندگی، استحکامِ خودی سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر خودی مستحکم نہیں تو پھر زندگی کی محض نمود و نمائش ہوتی ہے حقیقی زندگی حاصل نہیں ہوتی۔

گر بگیرد سوز و تاب از لَا اِلٰہ
جُز بکامِ او نہ گردد مہر و مہ

اور جب انسان، صرف ایک خدا کے قوانین کے سامنے جُھک کر اپنی خودی کو مستحکم کرلے تو خارجی کائنات کی تمام قوتیں اس کے تابع فرمان، اور اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

○

یہ اس عنوان کا آخری شعر ہے۔

باب نمبر ۵

حکمتِ فرعونی

سابقہ عنوان میں علاّمہ اقبالؒ نے "حکمتِ کلیمی" کی وضاحت کی تھی. یعنی یہ بتایا تھا کہ جب سیاست کو وحی کے تابع رکھا جائے تو نتائج کیا مرتب ہوتے ہیں. اس سے اگلا عنوان ہے

حکمتِ فرعونی

جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے. اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس سیاستِ بے دین کی اساس و بنیاد اور مقصود و مطلوب، دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں چار لفظوں میں سمٹا دیا گیا ہے اور اس حسن و خوبی سے جو اقبالؒ کے اسلوب بیان کی اوّلین خصوصیت ہے ملاحظہ فرمائیے.

حکمتِ اربابِ دیں کردم عیاں
حکمتِ اربابِ کیں را ہم بداں
حکمتِ اربابِ کیں مکر است و فن
مکر و فن؛ تخریبِ جاں تعمیرِ تن!

اس سیاست کا مقصود و منتہیٰ ہے — تخریبِ جاں، تعمیرِ تن — یہی وہ چار لفظ ہیں جن میں اس سیاست کی روح نکھر کر آگئی ہے.

زندگی کے متعلق دو تصوّرات ہیں. ایک تصوّر یہ کہ انسان عبارت ہے اپنے طبیعی جسم سے. یہ طبیعی قوانین

کے تابع زندہ رہتا ہے اور انہی قوانین کے مطابق اس پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام کدو کاوش کا ماحصل یہ ہے کہ اس کی دنیاوی زندگی خوش حالی میں گزرے۔ یہی تصور جب ایک قوم کا منتہائے نگاہ قرار پا جائے تو اس کا مقصدِ حیات یہ ہوتا ہے کہ کمزور اقوام کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی قوم کی مرفہ الحالی کا سامان پیدا کیا جائے۔ اس میں نہ کسی اصول کا خیال رکھا جاتا ہے، نہ بلند اقدار کا لحاظ۔ نہ جائز کا امتیاز ہوتا ہے نہ ناجائز کا۔ جائز وہ جس سے اپنی قوم کا فائدہ ہو اور ناجائز وہ جس سے اس کا نقصان ہو۔ لہٰذا اس سیاست کا مقصد "تعمیرِ تن" ہوتا ہے۔

اس کے برعکس دوسرا تصور یہ ہے کہ انسان صرف اپنے طبیعی جسم ہی سے عبارت نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات یا نفس کہا جاتا ہے۔ انسان کا مقصد اس ذات کی نشوونما ہے۔ یہ (ذات) انسان کی طبیعی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اسے حیاتِ اُخروی کہا جاتا ہے۔ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لئے قوانین (طبیعی) مقرر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کے لئے بھی قوانین ہیں۔ انہیں غیر متبدل اصولِ حیات یا مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ انسانی ذات کو "تن" کے مقابلہ میں "جان" کہہ کر بھی پکارتے ہیں۔ حکمتِ کلیمی کی غایت، تعمیرِ جان (یعنی انسانی ذات کی نشوونما) ہوتا ہے۔ اس میں تعمیرِ تن، مقصود بالذات نہیں ہوتی بلکہ تعمیرِ جان کا ذریعہ ہوتی ہے۔ لیکن حکمتِ فرعونی میں چونکہ تعمیرِ ذات کا تصور ہی نہیں ہوتا اس لئے اس کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ تخریبِ جاں، تعمیرِ تن ــــ اور اس کے لئے جو مکر و فریب بھی ضروری سمجھا جائے روا رکھا جاتا ہے۔ اس سے یہ دنیا جہنم بن جاتی ہے۔ جیسا کہ آج کل نمایاں طور پر ہو رہا ہے۔ اس سیاست کی خصوصیت یہ ہے کہ

حکمتے از بندِ دیں آزادۂ
از مقامِ شوق دُور افتادۂ

دین نام ہے ان مستقل اقدارِ حیات کا جو وحی کی رُو سے ملتی ہیں۔ اس سیاست میں ان حدود و قیود کا کوئی لحاظ ہی نہیں رکھا جاتا۔ یہ یا تو وحی کو تسلیم ہی نہیں کرتی (جیسا کہ کمیونزم میں ہے) اور یا اگر تسلیم کرتی ہے تو اسے پرستش گاہوں کی چار دیواری کے اندر محدود رکھتی ہے۔ عملی کاروبارِ حیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا (جیسا کہ عیسائی دنیا میں ہو رہا ہے ــــ در عیسائی دنیا ہی کیا اب تو ساری دنیا میں اسی اندازِ زندگی کا دَور دَورہ ہے) نتیجہ ان دونوں کا ایک ہے۔ دونوں ہی "حکمتِ فرعونی" پر مبنی ہیں۔ روس کی کمیونزم ہو یا مغرب کی جمہوریت۔ دین کے نقطۂ نگاہ سے دونوں مردود و ملعون ہیں۔

اس حکمت (سیاست) کا مدار، استعماریت پر ہوتا ہے۔ یعنی کمزور اقوام کو مغلوب رکھ کر انہیں اپنے مفاد کا آلۂ کار بنانا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے قومِ غالب کرتی یہ ہے کہ قومِ مغلوب کے بچّوں کی تعلیم کا نظام اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔

مکتب از تدبیرِ اُو گیرد نظام
تا بکامِ خواجہ اندیشد غلام

اس تعلیم سے اس محکوم قوم کے "تعلیم یافتہ" طبقہ کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبان میری ہے بات اُنکی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات اُن کی

اس کے بعد، اس قومِ غالب کی اسکیم یہ ہوتی ہے کہ یہ مذہبی پیشواؤں کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے اور وہ ان کی مرضی ومنشا کے مطابق دین کی تاویلیں کر کے، عوام کو ان کی اطاعت و فرماں برداری کی افیون گھول گھول کر پلاتے رہتے ہیں۔

شیخِ ملّت با حدیثِ دل نشیں
بر مرادِ اُو کند تجدیدِ دیں

یہ مذہبی پیشوا اتنا ہی نہیں کرتے کہ عوام کو قومِ حاکم کی اطاعت پر مائل رکھتے ہیں، یہ فرقہ بندیوں اور پارٹی بازیوں سے قوم کو آپس میں لڑاتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔

از دمِ اُو وحدتِ قومے دو نیم
کس حریفش نیست جُز چوبِ کلیم

اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ کوئی ڈنڈے والا آئے اور انہیں سیدھا کرے۔

وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر
کارِ اُو تخریبِ خود، تعمیرِ غیر

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم اپنی تخریب کرتی رہتی ہے اور قومِ غالب کی تعمیر۔ کس قدر بدبختی ہے اس قوم کی!

می شود در علم و فن صاحب نظر
از وجودِ خود نگردد باخبر

اس میں شبہ نہیں کہ اس قوم میں علم وفن کی کمی نہیں رہتی ـــ اس میں بڑے بڑے انجینئر، بڑے بڑے ڈاکٹر،

اچھے اچھے ٹیکنیشنز پیدا ہو جاتے ہیں لیکن یہ صرف قومِ حاکم کی مشینری کے کل پُرزے بنتے ہیں۔ اپنے ملّی وجود سے یکسر بیگانہ اور بے خبر رہتے ہیں۔

نقشِ حق را از نگینِ خود سُترد
در ضمیرش آرزو ہا زاد و مُرد

چونکہ یہ اس قوم کی مشینری کے کُل پُرزے بنتے ہیں جس کی سیاست خالص فرعونی ہے، اس لئے ان کے دل میں بھی حق و صداقت کا کوئی احترام نہیں رہتا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ان کے افسر جو کام ان کے سپرد کر دیں یہ میکانکی طور پر اسے سرانجام دے دیں گے لیکن ان کے اپنے دل میں اوّل تو کوئی آرزو پیدا ہی نہیں ہو گی اور اگر پیدا ہو گی تو وہیں مر جائے گی۔ آہستہ آہستہ اس قوم کے افراد کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

بے نصیب آمد ز اولادِ غیور
جاں بہ تن چو مردہ در خاکِ گور

یہ خود جیتے جاگتے انسان نہیں، بلکہ چلتی پھرتی لاشیں بن جاتے ہیں۔ اپنی حالت یہ ہو جاتی ہے اور ان کی اولاد کی کیفیت یہ کہ غلط تربیت و تعلیم سے ان میں غیرت و حمیت کی رمق تک باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا اس قوم کی موجودہ نسل بھی تباہ ہو جاتی ہے اور آنے والی نسلیں بھی برباد۔

از حیا بے گانہ پیرانِ کہن
نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن

قوم کے نوجوانوں کی یہ حالت کہ وہ عورتوں کی طرح اپنے بناؤ سنگھار میں لگے رہتے ہیں اس لئے کہ ان کے سامنے جسم کی پرورش اور تزئین و آرائش سے بلند کوئی مقصد ہی نہیں ہوتا۔ یہ حالت ہوتی ہے اس قوم کے نوجوانوں کی۔ باقی رہے ان کے بڑے بوڑھے تو چونکہ وہ بھی اسی تعلیم کے تیار کردہ ہوتے ہیں، اس لئے ان میں حیا اور غیرت ہی نہیں ہوتی ۔۔۔ ایک کی بیوی، دوسرے کی بہارِ آغوش۔ ایک کی لڑکی، دوسروں کی آرائشِ محفل۔

در دلِ شاں آرزو ہا بے ثبات
مردہ زایند از بطونِ اُمہات

چونکہ ان کے سامنے اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کے علاوہ کوئی نصب العین نہیں ہوتا اس لئے ان کے دل میں آرزوئیں بھی ہنگامی اور عارضی ہوتی ہیں۔ یہ زندگی کے حامل انسان نہیں ہوتے۔ یوں سمجھو جیسے عورت کے پیٹ سے

مُردہ بچّہ پیدا ہوا ہو۔ دیکھنے میں بالکل انسان لیکن زندگی سے عاری!

دُخترانِ اُو بزُلفِ خود اسیر
شوخ چشم و خودنما و خردہ گیر
ساختہ، پرداختہ، دل باختہ
ابرواں مثلِ دو تیغ آختہ
ساعدِ سیمینِ شاں عیشِ نظر
سینۂ ماہی بموج اندر نگر

یہ تو تھے اس قوم کے نوجوان لڑکے۔ اس کی لڑکیوں کی حالت ان سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ ان کے ذہن میں اُن کی زندگی (بلکہ پیدائش) کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ مرد کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ یہ اس کا کھلونا ہیں۔ اس لئے ان کی ساری کوشش اسی میں صرف ہوجاتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح مردوں کی نگاہ میں زیادہ سے زیادہ جاذب بن کر دکھائی دیں۔ وہ ہر وقت بننے سنورنے میں لگی رہتی ہیں۔ نمائشِ خویش کا جذبہ ان کے دل میں انگڑائیاں لیتا رہتا ہے۔ یہی جذبہ ہے جو انہیں اس قسم کا لباس زیبِ تن کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جس سے جسم عریاں ہو کر سامنے آجائے۔

یہ حالت ہوتی ہے اس قوم کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی جو لادین سیاست کے نظامِ تعلیم و تربیت کی پیدلواز ہوں۔ اس سے اس قوم کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ

ملّتے خاکسترِ اُو بے شرر
صبحِ اُو از شامِ اُو تاریک تر

وہ قوم راکھ کا ایسا ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے جس میں زندگی کی کوئی چنگاری تک باقی نہیں رہتی۔ اس کی صبح اس کی شام سے بھی زیادہ تاریک ہوتی ہے۔ اس کا حال بھی تباہ ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔

ہر زماں اندر تلاشِ ساز و برگ
کارِ اُو فکرِ معاش و ترسِ مرگ

ان کی ساری تگ وتاز "روٹی" کی نذر ہوجاتی ہے۔ معاشی پریشانیاں انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیتیں۔ صبح سے شام تک فکرِ معاش، اور ہر وقت موت کا ڈر ان کے اعصاب پر سوار۔ جب زندگی کے بلند مقاصد سامنے ہوں تو موت،

انسان کے لئے درخشندہ ترمستقبل کا دروازہ بن جاتی ہے. لیکن جب روٹی کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہے تو اسے ہر وقت یہ پریشانی رہتی ہے کہ اگر میری موت واقع ہوگئی تو میرے چھوٹے چھوٹے بچّوں کا کیا بنے گا؟ یہ کہاں سے کھائیں گے. یہ کیسے زندہ رہیں گے؟ اسی طرح انسان کی ساری عمر فکرِ معاش اور ترسِ مرگ میں گزر جاتی ہے.

یہ حالت ہوتی ہے اس قوم کے غریب یا متوسط طبقے کی. باقی رہے اس کے خوشحال لوگ، سو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

منعمانِ اُو بخیل و عیشِ دوست
غافل از مغز اندو اندر بندِ پوست

وہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں اور تن آسانی اور عیش پرستی کی زندگی بسر کرتے ہیں. دولت، زندگی کے بلند مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے. لیکن ان کے نزدیک یہ بجائے خویش مقصودِ حیات بن جاتی ہے. لیکن یہ ظاہر ہے کہ تنہا دولت سے آپ زندگی کے ظواہر کو خرید سکتے ہیں اس کے باطن کو نہیں سنوار سکتے. اور "باطن" (انسانی ذات کی نشوونما) چونکہ لادین معاشرہ کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہی نہیں، اس لئے اس قوم کے دولت مند طبقہ کی ساری عمر جسم اور اس کے لوازمات کے مرکز کے گرد گردش کرنے میں ضائع ہو جاتی ہے.

المختصر اس قوم کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

قوّتِ فرماں روا معبودِ اُو
در زیانِ دین و ایماں سودِ اُو

وہ ہمیشہ قومِ غالب کی پرستش کرتی رہتی ہے. وہی ان کا معبود ہوتی ہے اور انہی کی اطاعت، ان کی عبادت، وہ اپنے دین اور ایمان کو بیچ کر، دنیاوی مفاد حاصل کرتی ہے اور اسے بڑا نفع کا سودا سمجھتی ہے!

از حدِّ امروزِ خود، بیروں نجست
روزگارش نقشِ یک فردا نہ بست

ان کی نگاہ ہمیشہ پیش پا اُفتادہ مفاد پر رہتی ہے اس سے آگے جا ہی نہیں سکتی. ان کی نظروں میں مستقبل ہوتا ہی نہیں.

از نیاگاں دفترے اندر بغل
الاماں از گفتہ ہائے بے عمل

وہ اپنے ماضی کے زرّیں کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے رہتے ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو فریبِ نفس میں مبتلا رکھتے ہیں. اسلاف کی کتابیں بغل میں دابے، وہ سمجھتے ہیں کہ بس ساری دنیا کا علم ان کے قبضے میں ہے. وہ ان کے اقوال کو دنیائے تحقیق و تدقیق میں حرفِ آخر سمجھتے ہیں. اور ان کی اندھی تقلید میں فلاح و فوز کا راز. وہ ساری عمر دوسروں کو وعظ و تلقین کرتے رہتے ہیں، لیکن جو کچھ کہتے ہیں اس پر خود کبھی عمل نہیں کرتے.

دینِ اُو عہدِ وفا بستن بغیر
یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دَیر

اپنوں سے کٹ کر، دوسروں کے ساتھ ملنا، ان کا دین ہوتا ہے. وہ کعبہ کی اینٹوں سے کلیسا تعمیر کرتے ہیں.

آہ قومے دل ز حق پرداختہ
مُرد و مرگِ خویش را نشناختہ

کس قدر تباہ حال ہوتی ہے یہ قوم جو دینِ خداوندی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہے، اور یوں زندگی اور اس کی حرارتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور تماشا یہ کہ اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس پر موت طاری ہو چکی ہے. وہ اپنے آپ کو زندہ قوم سمجھتی ہے اور اس فریب میں مبتلا رہ کر دن گزار لیتی ہے. یہ عدمِ احساس سب سے بڑا نقصان ہے جو کسی قوم کو پہنچ سکتا ہے.

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

باب نمبر ۶

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

حکمتِ کلیمی اور حکمتِ فرعونی کی اس تمہیدی وضاحت کے بعد حضرت علامہؒ اُس اساس و بنیاد کی طرف آتے ہیں جس پر دین کے نظام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے. یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ.

دنیا میں جب کوئی قوم اپنے شعور کی آنکھ کھولتی ہے تو وہ اپنے گرد و پیش مختلف قوتوں کو کارفرما دیکھتی ہے. حکمران طبقہ کی قوت، دولت کی قوت، مذہبی پیشوائیت کی قوت، معاشرہ کے رسم و رواج کی قوت، اسلاف کی اندھی عقیدت کی قوت. اگر وہ قوم ان قوتوں میں سے کسی ایک قوت کے بھی تابع فرمان رہتی ہے تو وہ اپنے آپ کو آزاد نہیں کہہ سکتی. آزادی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان تمام بندھنوں کو ایک ایک کر کے توڑ دے. اسے کہتے ہیں لَآ اِلٰہ. یعنی دنیا میں کوئی ایسی قوت نہیں جس کے سامنے جھکا جائے، جس کی اطاعت اور محکومی اختیار کی جائے. ظاہر ہے کہ ان بندھنوں کو توڑنے اور ان قوتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے، بڑی ہمت اور قوت کی ضرورت ہے. اس میں، اِن سے ٹکراؤ ہوگا، تصادم ہوگا، تزاحم ہوگا.

اب فرض کیجئے کہ ایک قوم پیہم تصادمات اور مسلسل سپاہیانہ تگ و تاز سے ان قوتوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتی ہے، تو کیا یہ سمجھ لیا جائے گا کہ اسے مقصودِ حیات حاصل ہو گیا؟ بالکل نہیں. زندگی ایک نظام چاہتی ہے اور نظام نام ہے اپنے آپ کو قواعد و ضوابط کے تابع رکھنے کا. اس لئے اس قوم کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو قوانین کے تابع لائے. لیکن کس کے قوانین کے؟ صرف خدا کے قوانین کے جنہیں اس نے وحی کے ذریعہ عطا کیا ہے اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں. اسے کہتے ہیں، اِلَّا اللہ — یعنی دنیا میں کوئی

طاقت ایسی نہیں جس کے وضع کردہ آئین و قوانین کے سامنے جھکا جائے. لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ زندگی لاقانونیت کی بسر کی جائے۔ صحیح نظامِ زندگی یہ ہے کہ انسان، اللہ کے قوانین کے سامنے جھکے. اس سے اسے صحیح ثبات و سکون حاصل ہوگا۔

پہلا مرحلہ تخریب کا تھا. دوسرا تعمیر کا ہے. پہلا مرحلہ ان تمام عمارات کو گرانے کا تھا جو اس قوم کے معاشرہ کی زمین پر پہلے سے قائم تھیں. جب زمین اس طرح ہموار ہو جائے تو پھر دوسرا حصہ اس زمین پر، خدا کے عطا کردہ نقشے کے مطابق عمارتِ نو استوار کرنے کا آتا ہے یہ ہے مطلب — لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا — پیشِ نظر عنوان میں حضرت علامہؒ نے اس نکتہ کی وضاحت کی ہے. فرماتے ہیں.

نکتہ می گویم از مردانِ حال
اُمتاں را لَا جلال اِلَّا جمال

جیسا کہ اُوپر کہا جا چکا ہے. پہلا مرحلہ تصادم اور تزاحم کا ہوتا ہے جس میں بڑی قوت اور قہاری کی ضرورت ہوتی ہے. اس لئے وہ مرحلہ "جلال" کا ہے. اس کے بعد حسن کارانہ انداز سے تعمیر کا پروگرام سامنے آتا ہے یہ مرحلہ "جمال" کا ہے. جلال اور جمال دونوں کے امتزاج سے حُسن پیدا ہوتا ہے. اس پروگرام کا نام "ایمان اور اعمالِ صالح" ہے. دنیا سے ہر باطل کے نظام کو مٹا کر اس کی جگہ حق کے نظام کا قیام. اسی میں قوموں کی صحیح زندگی کا راز پوشیدہ ہے.

لَا و اِلَّا احتسابِ کائنات
لَا و اِلَّا فتحِ بابِ کائنات

ساری کائنات میں لَا و اِلَّا کا نظام کارفرما ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس سے یہ پرکھا جا سکتا ہے کہ اشیائے کائنات اپنی صحیح روش پر جا رہی ہیں یا نہیں. جب بیج زمین میں ڈال دیا جاتا ہے تو فطرت کی مختلف قوتیں بروئے کار آ جاتی ہیں. ان کا سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اس بیج کو پھاڑ کر رکھ دیں. یہ لَا کا مرحلہ ہے اگر بیج اسی مرحلہ میں رہ جائے تو اس کا نتیجہ تخریب ہوگا. لیکن جب اس بیج میں سے کونپل پھوٹتی ہے تو یہ اِلَّا (تعمیر) کے مرحلے کی ابتدا ہوتی ہے. اس سے ایک نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے. اس سے کامرانیوں کے دروازے کھلتے ہیں. اسی اصولِ حیات کو قوموں کی زندگی میں بھی عمل پیرا ہونا چاہیئے. اس سے وہ زندہ رہ سکتی اور آگے بڑھ سکتی ہیں.

ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نوں
حرکت از لا زاید از اِلّا سکوں

یہ دونوں قوتیں مل کر کائنات کو اس کی منزل کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی ہیں. پہلے مرحلہ میں وہ سرتا پا حرکت ہوتی ہے. دوسرے میں وہ نظام کی پابند ہو کر سکون حاصل کر لیتی ہے. یاد رکھئے دوسرے مرحلہ میں پہنچ کر بھی وہ ساکن نہیں ہو جاتی. ساکن ہو جانے اور سکون حاصل ہو جانے میں بڑا فرق ہے. دوسرے مرحلہ میں بھی وہ ہر وقت مصروفِ عمل رہتی ہے لیکن یہ عمل تعمیر کے لئے ہوتا ہے. اس لئے اس کا حاصل وہ حقیقی اطمینان ہوتا ہے جو حصولِ مقاصد کا فطری نتیجہ ہے.

تا نہ رمزِ لا اِلٰہ آید بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

جب تک کوئی قوم اس حقیقت کو نہ سمجھ لے کہ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جس کی اطاعت کی جائے، وہ غیر خدائی قوتوں کے بندھنوں کو توڑ نہیں سکتی اور جب تک ان بندھنوں کو نہ توڑ دے، اسے حقیقی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی.

درجہاں آغازِ کار از حرفِ لاست
ایں نخستیں منزلِ مردِ خداست

جو لوگ دنیا میں نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنا چاہیں ان کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ ہر غیر خدائی قوت کی اطاعت سے انکار کریں. جب تک یہ نہیں ہوگا، نظامِ خداوندی قائم نہیں ہو سکے گا.

ملتے کز سوزِ او یک دم تپید
از گِلِ خود خویش را باز آفرید

جب قوم نے غیر خدائی قوتوں سے مُنہ موڑ لیا، اس نے اپنی باز آفرینی کی طرف پہلا قدم اٹھا لیا. یہی اس کی نشأۃِ ثانیہ کا حرفِ آغاز ہے.

پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات
تازہ از ہنگامہ او کائنات

زندگی کی علامت یہ ہے کہ ہر غیر خدائی قوت سے برملا کہہ دیا جائے کہ ہم تمہاری اطاعت کے لئے تیار نہیں.

ہم تمہاری حکمرانی کو تسلیم ہی نہیں کرتے. جو ایسا کہنے کی ہمّت اور جرأت رکھتا ہے وہی دنیا میں صحیح انقلاب برپا کر سکتا ہے۔

از جنونش ہر گریباں چاک نیست
در خورِ ایں شعلہ ہر خاشاک نیست

لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اس اعلان کے لئے بڑی ہمّت کی ضرورت ہے. اس قسم کی ہمت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی. لیکن جسے یہ ہمّت میسّر آجائے اس کے انقلاب آفریں کارنامے، ہر کہنہ نظام کو تہ و بالا کر دیتے ہیں.

جذبۂ اُو در دلِ یک زندہ مرد
می کند صد رہ نشیں را رہ نورد

اس کا کہکشاں گیر ہاتھ اٹھتا ہے اور استبداد کی مسندوں پر بیٹھنے والوں کو خاک نشین بنا دیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علاّمہؒ ایک پیغام دیتے ہیں اور وہ یہ کہ

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟
تخمِ لَا درمشتِ خاکِ او بریز

اگر تم چاہتے ہو کہ محکوم اور مظلوم قوم مستبد حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کو یہ تعلیم دی جائے کہ دنیا میں کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو اپنا محکوم بنائے. جب یہ تعلیم ان کے دل میں اچھی طرح جاگزیں ہو جائے گی تو پھر وہ کسی کی محکومیت کو گوارا نہیں کر سکتے۔

ہر کرا ایں سوز باشد در جگر
ہوشش از ہولِ قیامت بیشتر

جس قوم کے دل میں یہ نظریہ اچھی طرح جاگزیں ہو جاتے اس سے دنیا کی ہر مستبد قوّت کو ڈرنا چاہیئے. ایسی قوم دنیا میں قیامت برپا کر سکتی ہے اور کوئی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا.

لَا مقامِ ضرب ہائے پَے بہ پَے
ایں غوِ رعد است نَے آوازِ نَے

ایسی قوم ہر بالا قوّت کو شکست دے سکتی ہے. کوئی اس کے مقابلے کی تاب نہیں لاسکتا. اس کے نعرۂ انقلاب میں بجلی کی سی کڑک اور بادل کی سی گرج ہوتی ہے جو فضائے کائنات میں تھرتھری پیدا کر دیتی ہے۔

ضربِ اُو ہر بود را سازد نبود
تا بروں آئی ز گردابِ وجود

اس کی ضرب ہر اس شخص یا گروہ کو جو دوسروں پر حکمرانی کرنے کا مدّعی ہو' ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیتی ہے. اس طرح دنیا میں کوئی قوت ایسی باقی نہیں رہتی جس کے وجود کو تسلیم کیا جائے. جب لَآ کا یہ مرحلہ اس طرح طے ہو جائے تو پھر خدا کی حکومت کے قیام کے لئے زمین ہموار ہو جاتی ہے اور دنیا میں صرف اس کی حکمرانی باقی رہ جاتی ہے' اس طرح لَآ اور اِلَّآ کے امتزاج سے ایک نئی دنیا وجود میں آجاتی ہے جس میں ہر مقام پر حق غالب ہوتا ہے.

اس کے بعد حضرت علاّمہؒ نے بتایا ہے کہ چودہ سو سال پہلے عرب کی سرزمین میں کس طرح اس تعلیم کو پھیلایا گیا اور اس صحرانشین قوم نے کس طرح دنیا کی باطل تہذیبوں کی بساط اُلٹ کر اس کی جگہ ایک نئی تہذیب کی طرح ڈال دی.

اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ دین کی اساس کس طرح لَآ اِلٰہَ ۔ اِلَّآ اللہ پر ہے. یعنی اس امر کی نفی کہ دنیا میں کوئی قوت ایسی ہے کہ جس کے سامنے جھکا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا اثبات کہ ایسی ایک اور صرف ایک قوت ہے. یعنی ذاتِ باری تعالیٰ. اطاعت اور محکومیت صرف اسی کے قوانین کی جائز ہے. جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے. کیونکہ اس کے بغیر نہ فرد کی ذات کی نشوونما ہو سکتی ہے اور نہ ہی امنِ عالم قائم رہ سکتا ہے. اس کے بعد علاّمہ اقبالؒ نے بتایا ہے کہ چودہ سو سال پہلے کس طرح عرب کی صحرانشیں قوم نے اس تعلیم کو اپنایا اور عام کیا اور اس کا نتیجہ کیا مرتّب ہوا.

با تو می گویم ز ایامِ عرب
تا بدانی پختہ و خامِ عرب
ریز ریز از ضربِ اُو لات و منات
در جہات آزاد از بندِ جہات

جب اس قوم نے اس بنیادی اصول (لَآ اِلٰہَ ۔ اِلَّآ اللہ) کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تو اس سے ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا. سب سے پہلے انہوں نے اپنے ان معبودانِ باطل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جن کے سامنے ان کی گردنیں صدیوں سے جھکی چلی آرہی تھیں. اس سے ان کی نگاہوں میں اس قدر وسعت اور ان کی گردنوں میں ایسا فراز پیدا ہو گیا کہ ان کی زندگی اس عالمِ محدود میں رہتے ہوئے' حدود فراموش اور جہت ناآشنا ہو گئی.

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ اُو
قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ اُو

انہوں نے اُن تمام غلط تصورات کو، جو ان کے ہاں صدیوں سے متوارث چلے آرہے تھے، مٹادیا، اور ایران و روم کی ملوکیت اور اس کے ساتھ ہی وہاں کی انسانیت سوز تہذیب کو ملیامیٹ کر دیا تاکہ مظلوم و مقہور انسان آزادی کا سانس لے سکے۔

گاہ دشت از برق و بارانش بدرد
گاہ بحر از زورِ طوفانش بدرد

وہ صحرائے عرب سے اُٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے بحر و بر پر چھا گئے اور اس طرح انہوں نے ہر نظامِ کہنہ کو تہ و بالا کر دیا۔

عالمے در آتشِ اُو مثلِ خس
ایں ہمہ ہنگامۂ لا بود و بس

انہوں نے جہاں جہاں غلط نظریاتِ زندگی اور باطل نظام ہائے حیات کو دیکھا انہیں جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ یہ سب کیا تھا؟ اس لا الہ پر ایمان کا نتیجہ! باطل کے ہر نظام کو مٹا دینا لا آلہ پر ایمان کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ حصّۂ تخریب ہے۔

اندریں دیرِ کہن بیہم تپید
تا جہانے تازہ آمد پدید

لیکن ان کا پروگرام صرف تخریبی نہیں تھا۔ یہ تمام تخریب اس تعمیر کا پیش خیمہ تھی جو ان کی مطلوب و مقصود تھی۔ انہوں نے ان غلط بنیادوں کو اکھیڑا تاکہ ان کی جگہ صحیح نظامِ زندگی کی نئی عمارت استوار کی جائے، چنانچہ یہ عمارت استوار ہوئی اور اس طرح ایک نئی دنیا وجود میں آگئی۔

بانگِ حق از صبح خیز یہائے اوست
ہر چہ ہست از تخم ریز یہائے اوست

یہ انہی کی بیداری کا نتیجہ تھا کہ دنیا میں حق کا آوازہ بلند ہوا۔ اس جہانِ رنگ و بو میں جہاں جہاں آپ کو گل ہائے تازہ نظر آتے ہیں سب انہی کی تخم ریزی کا ثمرہ ہے۔

اینکہ شمعِ لالہ روشن کردہ اند
از کنارِ جوئے اُو آوردہ اند

دنیا میں آپ کو جس قدر تہذیب و تمدّن کی رنگینیاں اور علم و ہنر کی ندرت آفرینیاں دکھائی دیتی ہیں، انہی عربوں کی رہینِ منت ہیں۔

انہوں نے اتنا عظیم انقلاب کس طرح برپا کر دیا؟ صرف اس طرح کہ

لوحِ دل از نقشِ غیرُ اللہ شُست
از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رُست

انہوں نے اللہ کے سوا ہر ایک تصوّر کو اپنے دل سے محو کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے بساطِ زندگی کے ہر گوشے میں انقلاب برپا کر دیا۔

اس کے بعد علّامہ اقبالؒ بتلاتے ہیں کہ ایک عظیم انقلاب خود ہمارے زمانے میں بھی برپا ہوا ہے۔ لیکن اس انقلاب اور مسلمانوں کے لائے ہوئے انقلاب میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مسلمانوں نے باطل کے نظامہائے کہنہ کو مٹایا تو ان کی جگہ حق کا نظام قائم کیا۔ یعنی ان کا انقلاب لا الٰہ ___ اور الّا اللہ، دونوں کا مجموعہ تھا۔ لیکن عہدِ حاضر کا یہ انقلاب صرف لا الٰہ تک رہا۔ الّا اللہ اس کے حصّے میں نہ آیا۔ اس کا دائرۂ عمل تخریب تک محدود رہا، تعمیر نہ کر سکا۔ اس لئے کہ صحیح تعمیر کی بنیادیں وحیٔ خداوندی پر اٹھتی ہیں اور وحیٔ خداوندی سے یہ محروم تھے۔ یہ انقلاب، روس کی اشتراکیت ہے۔

ہم چناں بینی کہ در دَورِ فرنگ
بندگی با خواجگی آمد بجنگ

جس طرح ایران اور روم کی تہذیبوں کے خلاف مسلمانوں نے علمِ انقلاب بلند کیا تھا اسی طرح تہذیبِ فرنگ کے خلاف بھی انقلاب کی آواز اٹھی۔ تہذیبِ فرنگ کی بنیاد بھی ملوکیت اور سرمایہ پرستی پر استوار تھی جسے مذہبی پیشوائیت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس تہذیب نے دنیا میں عالمگیر غلامی کا جال بچھا رکھا تھا۔ روس کا انقلاب، ملوکیت، سرمایہ پرستی اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف صدائے احتجاج تھا۔

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
از ضمیرش حرفِ لَا آمد بروں

انسانوں کی اس غلامی کے احساس کا جگر خون ہوگیا اور اس کے ضمیر نے چلا چلا کر کہا کہ استبداد کے اس پورے نظام کو تہس نہس کر دینا چاہیئے۔

آں نظامِ کہنہ را برہم زد است
تیز نیشے بر رگِ عالم زد است

اس نے تہیہ کر لیا کہ دنیا سے ہر کہنہ نظام کو مٹا دیا جائے اور جسدِ انسانیت کی فصد اس طرح کھولی جائے کہ اس سے تمام فساد آلود خون باہر نکل جائے۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ لکھتے ہیں کہ

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لَا سلاطیں ، لَا کلیسا ، لَا اِلٰہ

میں نے اشتراکیت کے فلسفہ اور نظام کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کے پیشِ نظر تخریب ہے تعمیر نہیں۔ بادشاہی کو مٹا دینا چاہیئے۔ مذہبی پیشوائیت کو فنا کر دینا چاہیئے۔ ہر اِلٰہ کو ختم کر دینا چاہیئے۔

فکرِ اُو در تُندِ بادِ لَا بماند
مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند

اس فلسفہ کی آماجگاہ لَا کا جھکڑ ہے اور بس۔ اِلَّا کی طرف اس کا رُخ ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام باطل نظام ہائے کہنہ کو مٹا دینے کے بعد پھر کیا؟ کیا انسانیت خلا میں زندہ رہ سکتی ہے؟ کیا خالی تخریب سے کوئی مثبت مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس انقلاب کے داعیوں کے دل میں سرمایہ داری، ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات اس قدر تلاطم انگیز تھے کہ اس ہیجان میں انہیں اتنا سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی کہ اس تخریب کے بعد اگلا تعمیری قدم کیا ہونا چاہیئے۔ اس لئے علامہ اقبالؒ کا خیال تھا کہ

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تُند باد آرد بروں

ایک دن آئے گا کہ یہ لوگ تخریب کے اس جھکڑ سے باہر نکل کر تعمیر کی طرف رُخ کریں گے۔ جب ان کے دل سے انتقام کی آگ فرو ہو گی۔ جب یہ جنوں ذرا کم ہو گا تو یہ اس بات کے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ زندگی کا مقصد تخریب

نہیں تعمیر ہے۔ اس وقت یہ محکم اصول ان کے سامنے آئے گا کہ

در مقامِ لَا نیاساید حیات
سوئے اِلَّا می خرامد کائنات

تخریب کی وادی میں زندگی کو سکون میسر نہیں آسکتا۔ خود نظامِ کائنات اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ ہر تخریب ایک تعمیر کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اور یوں یہ کائنات نفی اور اثبات کی اس مسلسل کشمکش سے، تعمیر کی طرف بڑھے چلی جارہی ہے۔ کائنات کا نصب العین تعمیری ہے۔

لَا و اِلَّا سازد برگِ اُمتاں
نفیِ بے اثبات مرگِ اُمتاں

قوموں کی زندگی اور عروج لَا اور اِلَّا دونوں کے امتزاج سے ہوتا ہے۔ جو قوم صرف تخریب کو اپنا نصب العین قرار دے لیتی ہے، فنا ہو جاتی ہے۔

در محبت پختہ کے گردد خلیل
تا نگردد لَا سوئے اِلَّا دلیل

حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ اس حقیقت کی دلیل ہے کہ محکم فلسفۂ حیات وہ ہے جس میں ہر باطل معبود کی نفی کے بعد ایک معبودِ حقیقی پر ایمان لایا جائے۔ ان کی قوم اجرامِ سماوی کی پرستش کرتی تھی، جب انہوں نے آپ سے کہا کہ وہ بھی ستارہ، چاند، سورج کو اپنا معبود تسلیم کریں تو آپ نے کہا کہ دیکھو! ان میں سے ہر ایک تغیر پذیر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو تغیر پذیر ہو وہ معبود نہیں ہوسکتا۔ یہ حصّہ لَا تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں اپنا رُخ اس معبودِ حقیقی کی طرف کرتا ہوں جو تغیرات سے ماوراء ہے اور تمام کائنات میں اقتدار و اختیار اسی کا کارفرما ہے۔ یہ حصّہ اِلَّا تھا۔ ایمان کی پختگی لَا اور اِلَّا کے اس امتزاج سے ہوتی ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ اپنے دَور کے مدعیانِ علمِ شریعت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لَا پیشِ نمرودے بزن

تم لوگ حجروں میں بیٹھے بے معنی بحثوں میں الجھے رہتے ہو۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ باطل کی قوتوں سے للکار کر کہو کہ تمہیں دنیا میں کوئی اقتدار اور اختیار حاصل نہیں۔ اپنی فرمانروائی کی مسندوں سے نیچے اترو۔ دنیا میں کسی انسان

کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور بس۔

این کہ می بینی نیرزد با دو جو
از جلالِ لَا اِلٰہ آگاہ شو

یہ تمہارے مسائل اور مباحث جنہیں تم اس قدر اہمیت دے رہے ہو ان کی کچھ قیمت نہیں۔ دین کی بنیاد لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ پر ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس سے حقیقی اسلام کا بول بالا ہوتا ہے۔

ہر کہ اندر دستِ اُو شمشیرِ لَاست
جملہ موجودات را فرماں رواست

جو اس حقیقت کو پا جائے اور دنیا سے ہر معبودِ باطل کو مٹانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ خارجی کائنات کی ساری قوتیں اس کے زیرِ نگیں آجاتی ہیں۔ یہی مقامِ مومن ہے۔

باب نمبر ۷

فقر

علامہ اقبالؒ نے اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے جو جدید اصطلاحات وضع اور اختیار کی تھیں، ان میں فقر کی اصطلاح کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ فقر سے ان کی مراد، گداگری، محتاجی، خانقاہیت یا رہبانیت نہیں۔ اس سے ان کی مراد اس قسم کا استغنا ہے جو انسان میں خدا کی صفتِ صمدیت کو (علیٰ حدِّ بشریت) منعکس کرتا ہے۔ استغنا کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی طبیعت اس قدر بھری ہوئی ہو کہ دنیا کی بڑی سے بڑی جاذبیت بھی اس کے پاؤں میں لغزش نہ پیدا کر سکے۔ جب وہ جادۂ حق و صداقت پر گامزن اپنے نصب العین کی طرف بڑھے جا رہا ہو تو مادّی کائنات کی کوئی کشش اس کے دامن گیر ہو کر اس کا راستہ نہ روک سکے۔ یاد رہے کہ مردِ مومن، دنیا کی زیبائش و آرائش سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ ان سب سے لذت یاب ہوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز اس کے راستے میں حائل ہو کر اس کے لئے زنجیر پا نہیں بن سکتی۔ مومن کی اس کیفیت کو اقبالؒ فقر سے تعبیر کرتا ہے۔ یہی وہ انقلاب ہے جو قوانینِ خداوندی کے اتباع سے مردِ مومن کے قلب و نگاہ میں پیدا ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں اس قسم کا انقلاب پیدا ہو جائے تو اس کے زورِ بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ یہی وہ فقر ہے جس کے متعلق حضرت علامہؒ کہتے ہیں کہ

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل
یک نگاہِ راہ بیں، یک زندہ دل

اے وہ لوگو جو مادّی لذائذ کے غلام بن چکے ہو، آؤ تمہیں بتائیں کہ فقر کسے کہتے ہیں! فقر یہ ہے کہ انسان کے سینے میں ایک متحرک قلب ہو جس میں نت نئی آرزوئیں بیدار اور نت نئے مقاصد پیدا ہوتے رہیں اور اس کے

ساتھ ہی ایک ایسی نگاہ جو صحیح راستے کو دیکھتی ہوئی اسے آگے بڑھاتی چلی جائے اور راستہ کی کوئی کشش اس کے لئے تسمہ پا نہ بن جائے۔ یہ ہے فقر، یعنی مادّی کائنات کا غلام بننے کے بجائے، اسے اپنا غلام بنالینا۔

فقر کارِ خویش را سنجیدن است
بر دو حرفِ لَا اِلٰہ پیچیدن است

فقر یہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر باطل قوت کو ٹھکراتا ہوا آگے بڑھتا جائے اور اپنے اُلجھے ہوئے معاملات کو خود سلجھائے۔ یہ کسی کا دست نگر اور محتاج نہ ہو۔

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر
بستۂ فتراکِ اُو سلطان و میر

اس استغنا سے انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ جَو کی روٹی کھا کر اپنے اندر ایسی قوت پیدا کرلیتا ہے جس سے بڑے بڑے محکم قلعوں کے دروازے توڑ ڈالتا ہے اور دنیا کے سلاطین اور اربابِ قوت و اقتدار اس کا شکار ہوتے ہیں۔

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست
ما امینیم، ایں متاعِ مصطفےٰؐ ست

یہ چیز اس طرح سے حاصل ہوتی ہے کہ انسان، قوانینِ خداوندی کے سامنے جُھک جائے اور پورے ذوق و شوق سے ان کی اطاعت کرے۔ اس شانِ فقر کی سب سے بڑی مظہر، نبیِ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم ہے۔ یہ فقر حضورؐ کی متاع ہے اور ہم اُمتی اس کے امین ہیں۔

فقر بر کرّوبیاں شبخوں زند
بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند

یہی وہ فقر ہے جس کے سامنے ملائکہ بھی جھکتے ہیں، اس سے کائنات کی قوتیں، انسان کے تابع تسخیر ہو جاتی ہیں۔ فقر کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کرکے انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف میں لائے۔

بر مقامِ دیگر اندازد ترا
از زجاج الماس می سازد ترا

یہی وہ انقلاب ہے جس سے انسان کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔ اس سے اس میں ایسی پختگی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ

کانچ سے الماس بن جاتا ہے. کانچ کو ذرا سی ٹھوکر لگ جائے تو وہ چکنا چور ہو جاتا ہے. اور الماس موٹے سے موٹے شیشے کو بھی کاٹ کر رکھ دیتا ہے.

برگ و سازِ اُو ز قرآنِ عظیم
مردِ درویشے نہ گنجد در گلیم

یہ فقر قرآنِ کریم کی متابعت سے حاصل ہوتا ہے. یہ خانقاہیت کا گلیم پوش فقر نہیں. یہ کائنات پر حکمرانی کرنے والا ہے.

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن
یک دمِ اُو گرمیٔ صد انجمن

وہ زیادہ باتیں نہیں کرتا. وہ کام کرتا ہے. اس میں ایمان اور عمل کی اس قدر حرارت ہوتی ہے کہ اس کا ایک سانس سینکڑوں محفلوں کی گرمی کا باعث بن جاتا ہے.

بے پراں را ذوقِ پروازے دہد
پشّہ را تمکینِ شہبازے دہد

وہ کمزور اور ناتواں انسانوں میں اتنی قوّت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ فضا کی پہنائیوں میں بلند سے بلند تر مقامات میں پرواز کرتے چلے جاتے ہیں. وہ ضعیف سے ضعیف تر انسان میں بھی عقابی روح بیدار اور اسے بازوئے شاہین عطا کر دیتا ہے.

باسلاطیں درفتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر

یہ مردِ فقیر' بادشاہوں سے اُلجھ جاتا ہے اور اس کے بوریا کی ہیبت سے شاہنشاہوں کے تخت لرز اُٹھتے ہیں.

از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر
وارہاند خلق را از جبر و قہر

وہ مستانہ وار اپنی دعوتِ انقلاب کو عام کرتا ہے اور اس طرح نوعِ انسان کو' ہر قسم کے استبداد اور ہر نوع کی غلامی سے آزاد کراتا ہے.

می نگیرد جز باں صحرا مقام
کاندرو شاہیں گریزد از حمام

وہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جن میں کسی کو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا. اس میں طاقتور انسان کمزوروں سے دبتا ہے.

قلبِ اُو را قوّت از جذب و سلوک
پیشِ سُلطاں نعرۂ اُو لا ملوک

ایمان کی پختگی اور عمل کی صالحیت اسے بے پناہ قوّت عطا کر دیتی ہے. وہ دنیا کے مستبد شاہنشاہوں کے سامنے کھڑا ہو کر برملا کہتا ہے کہ ملوکیت انسانیت کے خلاف جرمِ عظیم ہے اس لئے اُسے مٹا دیا جائے گا.

آتشِ ما سوزناک از خاکِ اُو
شعلہ ترسد از خس و خاشاکِ اُو

یہی وہ افراد ہیں جن کی سیرت آنے والوں کے لئے وجۂ حرارتِ ایمان بنتی ہے اور باطل کی قوّتیں ان کے ذکر سے لرزہ براندام ہو جاتی ہیں.

برنیفتد ملّتے اندر نبرد
تا درو باقیست یک درویش مرد

جب تک کسی قوم میں اس قسم کا ایک فرد بھی باقی ہو وہ مصافِ زندگی میں کسی سے شکست نہیں کھاتی.

آبروئے ما ز استغنائے اوست
سوزِ ما از شوقِ بے پروائے اوست

ایسے مردِ مومن کا استغنا، ہماری عزّت و تکریم کا ضامن ہے اُس کی وجہ سے دنیا میں ہماری آبرو باقی ہے. اس کا پختہ ایمان ہمارے دل میں حرارت پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے.

خویشتن را اندر ایں آئینہ بیں
تا ترا بخشند سُلطانِ مُبیں

تم اپنے اندر اس قسم کی سیرت و کردار پیدا کرو. ایسے مردِ مومن کو اپنے سامنے ماڈل رکھو پھر دیکھو کہ تمہیں بھی وہ قوّت کس طرح حاصل ہو جاتی ہے جو دنیا میں تمہارا سکّہ جما دے.

حکمتِ دیں دل نوازی ہائے فقر
قوّتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

یہی وہ فقر ہے کہ جب وہ تالیفِ قلوب کی طرف آتا ہے تو اسے دین کی حکمت کہا جاتا ہے اور جب وہ سرکش اور متکبّر قوّتوں کی چوکھٹوں سے مستانہ وار بے نیازانہ گزرتا ہے تو اسے دین کی قوّت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مومناں راگفت آں سُلطانِؐ دیں
مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں

حضور نبیؐ اکرمؐ نے اپنی اُمّت سے فرمایا تھا کہ "تمام روئے زمین میری مسجد ہے" اس کا مطلب یہ تھا کہ دینِ خداوندی کا غلبہ ساری رُوئے زمین پر ہونا چاہیئے۔

الاماں از گردشِ نُہ آسماں
مسجدِ مومن بدستِ دیگراں

لیکن کس قدر تأسّف کا مقام ہے، اور یہ انقلاب کیسا جگر پاش ہے کہ آج "مومنوں کی مسجد" (یعنی کرّہ ارض کے مختلف ممالک و دیار) غیروں کے قبضہ میں ہے۔

سخت کوشد بندۂ پاکیزہ کیش
تا بگیرد مسجدِ مولائے خویش

مومن کا فریضہ یہ ہے کہ وہ جان لڑا دے اور اپنے آقا[۴] کی اس مسجد کو غیروں کے قبضہ سے چھڑا لے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے حضرت علامہؒ نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اس کے بعد وہ فقر کے غیر اسلامی تصوّر کے حاملین (مسلکِ خانقاہیت کے پیروؤں) سے کہتے ہیں کہ

اے کہ از ترکِ جہاں گوئی مگو
ترکِ ایں دَیرِ کہن تسخیرِ اُو

تم مسلمانوں کو ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے ہو اور اسے دین کا ماحصل قرار دیتے ہو۔ اس تعلیم کو چھوڑ دو۔ مسلمانوں کو یہ غیر اسلامی سبق نہ پڑھاؤ۔ مومن کا "ترک" یہ ہے کہ وہ کائنات کی تمام قوّتوں کو مسخّر کرے اور انہیں نوعِ انسان

کی بہبود کے لئے قوانینِ خداوندی کے مطابق عام کردے۔ اس لئے کہ

کمالِ ترک نہیں آب وگل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

صحیح تعلیم یہ ہے کہ

راہبش بودن ازو وارستن است
از مقامِ آب وگل برجستن است

اگر تم مادی دنیا سے مغلوب ہو تو یہ روش غیر اسلامی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اس کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہو۔ لیکن اگر تم اس پر غالب ہو اور اسے مسخر کر رکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس میں پھنسے ہوئے نہیں۔ "مادی آلائشوں کا ترک" انہیں اپنے تابع تسخیر بنالینا ہے۔

صیدِ مومن ایں جہانِ آب وگل
باز را گوئی کہ صیدِ خود بہل ؟

مادی دنیا تو مومن کا شکار ہے۔ اسے ترکِ دنیا کی تعلیم دینے کا مطلب یہ ہے کہ باز سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنے شکار کو چھوڑ دے۔ کس قدر غلط ہے یہ تعلیم۔

حل نہ شد ایں معنئ مشکل مرا
شاہیں از افلاک بگریزد چرا

میں تو اس معمّہ کو سمجھ نہیں سکا کہ عقاب کو یہ سبق دیا جائے کہ وہ فضا کی پہنائیوں میں اُڑنا چھوڑ دے! وہ کیوں ایسا کرے ؟

وائے آں شاہیں کہ شاہینی نکرد
مرغکے از چنگِ او نامد بدرد
درکنامے ماند زار و سرنگوں
پر نہ زد اندر فضائے نیلگوں

کس قدر بدقسمت ہے وہ عقاب، جس میں خوئے عقابی باقی نہ رہے۔ وہ اپنے شکار پر جھپٹنے کے بجائے اپنے گھونسلے میں سر چھپائے پڑا رہے۔ تصوّف، مسلمان کو یہی سکھاتا ہے اور اسی لئے حضرت علامہؒ نے اسے اسلام کی

سرزمین میں اجنبی پودے سے تعبیر کیا ہے۔

"فقر" کے متعلق تمہیدی تشریحات سامنے آچکی ہیں، اس کے بعد قرآنی اور غیر قرآنی فقر کا فرق بیان کیا گیا ہے۔ اس نکتہ کو پھر دہرا دیا جائے کہ جس طرح قرآنِ کریم کی اپنی مخصوص اصطلاحات ہیں، اسی طرح اقبالؒ نے بھی قدیم الفاظ اور اصطلاحات کو نئے معانی پہنائے ہیں۔ پیامِ اقبالؒ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان مخصوص معانی کو سمجھ لیا جائے۔ جن میں ان قدیم الفاظ و اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے۔ قرآنی فقر سے مفہوم یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کیا جائے اور انہیں نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے اس طرح عام کر دیا جائے کہ اگر ان میں سے اپنے لئے بھی کچھ نہ رہے تو اس محرومی کا احساس تک نہ ہونے پائے۔ بلکہ انسان مطمئن ہو کہ اس نے دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دی ہے اور یہی قرآن کی تعلیم ہے ۔۔۔ "یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَ لَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ" (۵۹/۹) مومن کی خصوصیت ہے ۔۔۔ قرآنی فقر کے متعلق حضرت علامہؒ لکھتے ہیں:

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود
نے رباب و مستی و رقص و سرود

جماعتِ مومنین کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہیں شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی ان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کا محاسبہ کریں۔ ان پر نگران رہیں یہ دیکھنے کے لئے کہ ان میں سے کوئی عدل و انصاف کی راہ کو تو نہیں چھوڑتا۔ اقبالؒ کہتا ہے کہ قرآنی فقر سے مراد ہے پوری کائنات کا محاسبہ کرنا۔ کائنات میں اشیائے فطرت بھی آجائیں گی اور اقوامِ عالم بھی۔ اس کا نام ہے فقر۔ نہ کہ قوالی اور وجد اور حال۔ قوالی اور وجد کو تو صوفیوں کے اکثر مسالک میں جزوِ عبادت قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن مولانا رومؒ کی طرف منسوب کردہ طریقِ تصوف میں، اس کے ساتھ رقص بھی شامل ہے۔ اس طریق میں درویش رقص بھی کرتے ہیں۔

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیرِ اُو مولا صفات

اس شعر میں مزید وضاحت ہو گئی ہے کہ مومن کا فقر، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا ہے لیکن یہ تسخیرِ فطرت مغرب کی مادہ پرست اقوام کی نہیں جس کا نتیجہ ایک دوسرے کی تباہی اور بربادی ہے۔ مومن خارجی کائنات میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی قرآن کی تربیت سے اپنے اندر ایسی تبدیلی کرتا چلا جاتا ہے جس سے

اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ ذات کی نشوونما کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں اللہ تعالیٰ کی صفات (بحدِ بشریت) منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فطرت کی یہ قوتیں نوعِ انسان کی نشوونما میں صرف ہوتی ہیں نہ کہ ان کی تخریب کے لئے۔ اس لئے کہ اللہ کی جس صفت کا قرآن نے سب سے پہلے ذکر کیا ہے وہ صفتِ ربّ العالمینی ہے۔ جو جماعت خدا کی اس صفت کی مظہر ہوگی اس کا فریضہ انسانیت کی عالمگیر نشوونما ہوگا۔

فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است
فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است

خانقاہوں اور حجروں کے اندر مراقبوں میں بیٹھ جانا یا باہر جنگلوں، پہاڑوں اور ویرانوں میں چلّے کاٹنا ــــ یا ترکِ دنیا کو مقصودِ روحانیت سمجھ لینا ــــ اقبالؒ کے الفاظ میں فقرِ کافر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ــــ تصوّف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے۔" مومن کا فقر وہ ہے جس سے خشکی اور تری (ساری کائنات) میں لرزہ پیدا ہو جائے۔

زندگی آں را سکونِ غار و کوہ
زندگی ایں را ز مرگِ باشکوہ

اس فقر (یعنی فقرِ کافر) کی رُو سے زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسان، پہاڑوں اور غاروں میں جاکر سکونِ قلب کی تلاش اور منازلِ روحانیت کو طے کرے۔ یہ فریبِ نفس ہے جو کشمکشِ زندگی سے فرار کو تقدّس کے نقاب میں چھپاتا ہے۔ مومن کا فقر یہ ہے کہ باطل کا ہر آن مقابلہ کیا جائے اور اس کے لئے عند الضرورت کفن بدوش اور شمشیر بکف میدانِ جنگ میں نکل آئے۔ اسی کا نام مرگِ باشکوہ یا مرگِ باشرف ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک زندگی نام ہی مرگِ باشرف کا ہے۔ حیاتِ بے شرف موت ہے۔

آں خدا را جُستن از ترکِ بدن
ایں خودی را بر فسانِ حق زدن

تصوّف میں ترکِ دنیا سے خدا کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ رہبانیت ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ یہ لوگوں کا خود ساختہ مسلک ہے۔ خدا کا تجویز کردہ نہیں۔ اسلام ترکِ دنیا نہیں سکھاتا۔ (۵۷/۲۷) اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان قوانینِ خداوندی کے اتّباع سے اپنی خودی (ذات) کو مستحکم سے مستحکم کرتا چلا جائے اور

اس کے زورِ دروں سے کائنات کو مغلوب و مفتوح بنائے۔

آں خودی را کشتن و واسوختن
ایں خودی را چوں چراغ افروختن

تصوّف کا مقصود و منتہیٰ انسانی ذات کو اس طرح فنا کر دینا ہے کہ وہ ذاتِ خداوندی میں جذب ہو جائے اور اس طرح جزو اپنی اصل سے مل جائے۔ لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے، قندیلِ خودی کو تابندہ سے تابندہ تر کیا جائے۔ اس کی مضمر صلاحیتوں کو اس طرح مشہود کیا جائے کہ یہ حیاتِ جاوداں حاصل کر لے۔

فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر
از نہیبِ اُو بلرزد ماہ و مہر

جب جماعتِ مومنین ان مقاصدِ حیات کو لے کر باہر نکلتی ہے تو ان کی ہیبت سے چاند اور سورج تک پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہ فقر، سر بزیری، بے کسی اور بے بسی، محتاجی اور ضعیفی نہیں۔ یہ تقدیر شکن قوّت کا نام ہے جس کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔

فقرِ عریاں گرمیٔ بدر و حنین
فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ

اس فقر کے مظاہرے بدر و حنین کے میدانوں میں ہوئے تھے۔ جب جماعتِ مومنین، حق کی مدافعت کے لئے سر بکف باہر آگئی تھی۔ "اس فقر" نے وہاں کیا کیا معجزات دکھائے۔ اس پر تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔ فقر کے باہر آنے سے مراد یہ ہے کہ انسان باطل کا چیلنج قبول کرے اور تبسّم برلب موت کو گلے لگا لے۔

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہ ہے فقرِ قرآں جس کے مظاہرے محمدٌ رسول اللہ والذین معہٗ کے دورِ ہمایوں میں ہوئے۔ اس کے بعد۔

فقر را تا ذوقِ عریانی نماند
آں جلال اندر مسلمانی نماند

جب مسلمانوں میں ایمان کی وہ شان باقی نہ رہی تو ان کی قوّت بھی ختم ہو گئی۔ پھر دنیا کی پست ترین ــــ اور

کمزور ترین قوموں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ اور اس کے بعد آج تک یہی حالت چلی آ رہی ہے بلکہ دن بدن بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

وائے ما اے وائے ایں دیرِ کہن
تیغِ لَا در کف نہ تو داری، نہ من

اب علامہؒ مسلمانِ عصرِ حاضر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ہماری کس قدر بدقسمتی اور حرماں نصیبی ہے کہ وہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم جس سے باطل کی ہر قوت کو فنا کرنا تھا اب ہم میں سے کسی کے پاس بھی موجود نہیں ــــ لَا کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں باطل کی کوئی قوت باقی نہ رہے۔ اور اِلّا سے مفہوم یہ ہے کہ ہر جگہ قوانینِ خداوندی کی حکمرانی ہو۔ مسلمان کا فریضۂ زندگی یہ تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے بے پناہ قوت کی ضرورت ہے۔ اور قوت اب دنیا میں کسی مسلمان کے ہاں بھی نظر نہیں آتی۔

دل ز غیر اللہ بہ پرداز اے جواں
ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں

علامہ اقبالؒ، قوم کی حیاتِ تازہ اور نشاۃِ ثانیہ کے لئے ہمیشہ نوجوانانِ ملت کو مخاطب کرتے ہیں وہ انہی سے اپنی توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔ انہی کے متعلق ان کا یقین ہے کہ۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

اس لئے اس کیفیت کو بیان کرنے کے بعد، وہ نوجوانانِ ملت سے کہتے ہیں کہ تم باطل کی قوتوں سے منہ موڑو اور دنیا کے ان دروازوں کو دوبارہ کھولو جن کے راستے کاروانِ انسانیت نے ترقی کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا اور جو مدتوں سے بند پڑے ہیں۔

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن
اے مسلماں! مُردن است ایں زیستن

دین کی غیرت کے بغیر کب تک جیو گے۔ یہ زندگی، زندگی نہیں، موت ہے۔ حیاتِ بے شرف سے مرگِ باشرف ہزار درجہ بہتر ہے۔

مردِ حق باز آفریند خویش را
جُز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

قرآن پر ایمان رکھنے والا اپنے اندر ایک نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ـــــ اپنے ارادوں اور تمنّاؤں اور اعمال و افعال کو ـــــ ہمیشہ وحیٔ خداوندی کی روشنی میں دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اندر حیاتِ نو بھی پیدا کر لیتا ہے اور قدم قدم پر اپنا محاسبہ بھی کرتا رہتا ہے۔

بر عیارِ مصطفیٰؐ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

وہ حضور نبیٔ اکرمؐ کے اُسوۂ حسنہ کو اپنے سامنے بطور معیار رکھتا ہے اور اپنی سیرت کو اسی قالب میں ڈھالتا ہے۔ اس طرح جب اس کے اندر ایک داخلی انقلاب پیدا ہو جاتا ہے تو پھر باہر بھی ایک نئی دنیا پیدا کر لیتا ہے۔ قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

اس کے بعد حضرت علامہؒ، اُمّتِ مرحومہ کی داستانِ دلخراش بیان کرتے ہیں کہ یہ کیا تھی، اور اب کیا ہو گئی۔

آہ زاں قومے کہ از پا بر فتاد
میر و سلطاں زاد و درویشے نزاد

کس قدر تأسف انگیز ہے داستان اس قوم کی جو اپنے مقامِ بلند سے نیچے گری تو پھر گرتی ہی چلی گئی۔ دوبارہ اٹھی نہیں۔ اس کے اس گرنے کا نتیجہ ہے کہ اس میں بڑے بڑے بادشاہ، زمیندار، جاگیردار، سرمایہ پرست تو بہت پیدا ہوئے لیکن مردِ مومن ایک بھی پیدا نہ ہوا۔

داستانِ اُو مپرس از من کہ من
چوں بگویم آنچہ ناید در سخن
در گلویم گریہ ہا گردد گرہ
ایں قیامت اندرونِ سینہ بہ

آپ اس کی جگر خراش داستان کو مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ مجھ میں ہمت ہی نہیں کہ میں اسے الفاظ میں بیان کر سکوں۔ جب بھی میں اس کی کوشش کرتا ہوں تو غم کی شدت کچھ اس طرح میرے گلوگیر ہو جاتی ہے کہ میں زبان سے ایک حرف بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس لئے آپ مجھے مجبور نہ کریں کہ میں اس حدیثِ الم انگیز کو الفاظ میں بیان

کروں. یہ قیامت میرے سینے کے اندر ہی رہے تو بہتر ہے.

مسلمِ ایں کشور از خود ناامید
عمرہا شد با خدا مردے ندید

باقی دنیا کے مسلم ممالک کو چھوڑیئے. اس برِصغیر ہند و پاک کی حالت یہ ہے کہ یہاں کا مسلم اپنے مستقبل کی طرف سے یکسر ناامید ہو چکا ہے. حقیقت یہ ہے کہ مدتیں گزر گئیں یہاں کوئی مردِ مومن پیدا ہی نہیں ہوا ــــ اور ظاہر ہے کہ جس سرزمین میں مُدّت سے کوئی انسان پیدا نہ ہوا ہو، اس کی حیاتِ نَو کے متعلق کیا امید کی جا سکتی ہے.

لاجرم از قوّتِ دیں بدظن است
کاروانِ خویش را خود رہزن است

یہی نہیں کہ اس کے بازوؤں میں مخالفین کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں رہی، یہ اسلام کے متعلق ناامید ہو چکا ہے. اسے اس کا یقین ہی نہیں رہا کہ اسلام ایک قوّتِ متحرکہ ہے جو اسے نہ صرف دنیا کی زندہ قوموں کی صف میں کھڑا کر سکتی ہے، بلکہ اسے نوعِ انسان کی امامت کا مستحق بنا سکتی ہے. یہ دین کی صلاحیتوں کی طرف سے بدظن ہو چکا ہے. اسے اس پر ایمان ہی نہیں رہا. دین کی طرف سے اس قسم کی بدظنی عوام میں نہیں، بلکہ ان کے خواص کے دل کی گہرائیوں میں گھر کر گئی. چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے جید علماء ایک آزاد مملکت کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے بجائے، ہندوستان کی سیکولر حکومت کے تابع زندگی بسر کرنے پر مطمئن ہو گئے. اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ حضرات اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے. چنانچہ اس کی شہادت ان علماء کے قافلہ کے سرخیل مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کے اس بیان سے ملتی ہے جو ان کی آخری تصنیف "انڈیا ونز فریڈم" میں ہے. مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ اسلام کی رُو سے انسانوں میں وجہِ جامعیت آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے. زبان، رنگ، نسل، جغرافیائی حدود کا اشتراک نہیں. مغربی اور مشرقی پاکستان کے مسلمان دوسری تمام باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف کیوں نہ ہوں، ان کی آئیڈیالوجی (ایمان) مشترک ہے. اس لئے اس بنیادی وجہِ اشتراک کی بنا پر وہ ایک قوم کے افراد ہیں. اس دعویٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا آزاد (مرحوم) کہتے ہیں کہ

> یہ کہنا کہ جغرافیائی حدود، معیشت، زبان، ثقافت کے اختلاف کے باوجود، ان خطوں کے مسلمان محض مذہب کی بنیادوں پر ایک (قوم) بن سکتے ہیں، بہت بڑا فریب ہے جس میں ان لوگوں

کو مبتلا رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے ایک ایسی اُمت کی تشکیل کی کوشش کی تھی جو نسل، زبان، معیشت اور سیاسیات کی حدود وقیود سے بلند ہو کر محض بر بنائے مذہب ایک معاشرہ بن جائے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس کی تشکیل کردہ سوسائٹی زیادہ سے زیادہ ایک سوسال تک قائم رہ سکی۔ اس کے بعد اسلام اپنی اس کوشش میں ناکام ہوگیا کہ وہ محض دین کی بنیادوں پر مختلف ملکوں کے مسلمانوں کو ایک مملکت میں جمع کر سکے۔ (صـ۲۲۷)

لہٰذا اس ناکام تجربہ کو دہرانا حماقت ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت دینا فریب دہی۔ یہ تھی اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوسی، جس کی طرف حضرت علامہؒ نے اشارہ کیا ہے۔ اور یہی مایوس شدہ حضرات تھے جن کے متعلق کہا ہے کہ وہ اپنے قافلہ کے قافلہ سالار نہیں تھے۔ اس کے رہزن تھے۔ اس سے بڑی رہزنی اور کیا ہو سکتی ہے کہ کاررواں کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے کے بجائے تباہیوں کے جہنّم میں دھکیل دیا جائے۔ قرآن کے الفاظ میں۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ "کیا تُو نے ان لوگوں کی حالت پر کبھی غور کیا جنہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناقدرشناسی کی۔ اور اپنی قوم کے کاررواں کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنس کا کوئی خریدار نہ ہو۔ جَھَنَّمَ یَصْلَوْنَھَا یعنی انہیں تباہیوں کے جہنّم میں دھکیل دیا۔ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝ (۱۴/۲۸) کتنا بُرا ہے وہ ٹھکانہ جسے انہوں نے اپنے قافلہ کے لئے تجویز کیا ہے۔

اس قوم کی حالت یہ ہے کہ

از سہ قرن ایں اُمتِ خوار و زبوں
زندہ بے سوز و سرورِ اندروں

تین سوسال سے اس قوم کی حالت یہ ہے کہ اس کا دل ایمان کے سوزوگداز سے خالی ہوچکا ہے اور یہ دنیا میں ذلیل و خوار زندگی بسر کررہی ہے ۔۔۔ حضرت علامہؒ کے خیال کے مطابق ہندوستان میں آخری مردِ مومن حضرت مجدد سرہندی (علیہ الرحمۃ) تھے۔ اس کے بعد یہاں کوئی بلند مرتبت مردِ مسلماں پیدا نہیں ہوا۔ اسی موت کو وہ سہ قرن (تین صدیوں) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں شُبہ نہیں کہ امام سرہندی (علیہ الرحمۃ) کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور اس زمانے میں ان کی ہستی مغتنمات میں سے تھی۔ لیکن ایسا مردِ مومن جو رُوحِ عمرؓ کو سینے میں

لئے آگے بڑھتا اور ملّتِ اسلامیہ میں وہ داخلی اور خارجی انقلاب برپا کر دیتا جس کا نظارہ آسمان کی آنکھ نے عہدِ محمدٌ رسول اللہ والذین معہٗ میں دیکھا تھا۔ اس دَور کے بعد پھر پیدا ہی نہیں ہوا۔ بہرحال قوم پر کتنی صدیاں بھی کیوں نہ گزری ہوں اس کی حالت یہ ہے کہ

پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق
مکتب و ملّائے اُو محرومِ شوق

نہ اس کے فکر میں بلندی ہے نہ سیرت میں پختگی۔ نہ نگاہ میں طرفگی ہے نہ ذوق میں لطافت اور شگفتگی۔ قوموں کو یہ چیزیں صحیح تعلیم سے حاصل ہُوا کرتی ہیں لیکن اس کی مذہبی درسگاہیں اور ان کے معلّم 'ملّا' شوق سے محروم اور ذوق سے ناآشنا ہیں۔

زشتیٔ اندیشہ اُو را خوار کرد
افتراق اُو را ز خود بیزار کرد

اس کی عقل و بصیرت کی بدنہاری نے اسے ذلیل و خوار کر رکھا ہے۔ پھر باہمی افتراق اور اختلاف سے اس کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ وہ اپنے آپ سے بیزار ہے۔

تا نداند از مقام و منزلش
مُرد ذوقِ انقلاب اندر دلش

قرآن نے اُمّتِ مسلمہ کو نوعِ انسان کی بہترین قوم قرار دیا ہے۔ مومن کو ہر ایک مقام پر غالب کیا ہے۔ اسے اقوامِ عالم کی لیڈرشپ (امامت) کا حقدار بتایا ہے۔ یہ ہے مومن کا صحیح مقام۔ لیکن چونکہ ملّا نہ اپنے مقام سے واقف ہے اور نہ ہی اس منزل سے جہاں اسے پہنچنا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں انقلاب پیدا کرنے کی تمام آرزوئیں مردہ ہو چکی ہیں۔

طبعِ اُو بے صحبتِ مردِ خبیر
خستہ و افسردہ و حق ناپذیر

چونکہ اسے کسی ایسے مردِ مومن کی صحبت میسّر نہیں آئی جو مومن کے مقام اور کاروانِ ملّت کی منزل سے باخبر ہو، اس لئے اس کی زندگی بے حد خستہ و خراب گزر رہی ہے حتّٰی کہ اس میں حق کے قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔

بندۂ رد کردۂ مولاست اُو
مفلس و قلاش و بے پرواست اُو

اس کی حالت اس غلام کی سی ہے جس کا آقا اسے نالائق و ناہنجار قرار دے کر نکال دے. مسلمان، راندۂ بارگاہِ خداوندی ہے. اور یہی وجہ ہے کہ وہ مفلس و قلاش ہے اور اسے دین و دنیا کا کچھ ہوش ہی نہیں. لیکن طرفہ تماشا یہ کہ بجائے اس کے کہ یہ سمجھے کہ میری مفلسی اور قلاشی سے ثابت ہوتا ہے کہ میں مردودِ بارگاہ ہوں، اسے اُلٹا مقربِ بارگہِ خداوندی ہونے کی علامت بتاتا ہے. کس قدر بڑا ہے یہ فریب جس میں یہ مبتلا ہے. اس کے مردُود ہونے کی حالت یہ ہے کہ

نے بکف مالے کہ سلطانے برد
نے بدل نورے کہ شیطانے برد

نہ اس کے پاس مال و دولت ہی ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا کی سلطنتیں اسے کسی توجہ کا مستحق سمجھیں اور نہ ہی اس کے دل میں متاعِ ایمان ہے جسے غارت کرنے کے لئے شیطان ہی اسے درخورِ اعتنا سمجھے. یہ یکسر جنسِ کاسد ہے جسے دنیا میں کوئی پوچھتا تک نہیں. یہ اس کی ذلت و خواری کی انتہا ہے.

شیخِ اُو لُردِ فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقامِ بایزید

یہ تو ان کے عوام کی حالت ہے. ان میں، سب سے بڑا، جو اپنے آپ کو بایزید بُسطامیؒ کے مقام پر سمجھتا ہے. اس کی حالت یہ ہے کہ

گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است

وہ قوم کو انگریز کی محکومی کا سبق پڑھا رہا ہے. اس کے نزدیک اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تم ہمیشہ حکومت کے وفادار رہو. خواہ وہ حکومت کسی کی ہو ـــــ اور اس کے سایۂ عاطفت میں رہتے ہوئے غلامی کی زندگی میں امن و چین سے دن گزارو. چنانچہ اس کی حالت یہ رہی ہے کہ

دولتِ اغیار را رحمت شمُرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد!

انگریزوں کی حکومت وسلطنت کو خدا کی رحمت قرار دیتا ہے۔ ساری عمر انگریز حکام کی کوٹھیوں کا طواف کرتا ہے اور یہی کچھ کرتے مر گیا۔

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں اشارہ میرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی طرف ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے کئی ایک دیگر مقامات میں بھی بیان کیا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر مسلمان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد
می شناسی عصرِ ما با ما چہ کرد

اے وہ کہ تیرا سینہ، زندہ آرزوؤں اور تابندہ تمناؤں کا مدفن بن چکا ہے، تو ذوق وشوق کی لذت سے محروم اور درد و سوز کے کیف سے ناآشنا ہو چکا ہے۔ تجھے کچھ معلوم بھی ہے کہ عصرِ حاضر نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؛

عصرِ ما مارا ز ما بے گانہ کرد
از جمالِ مصطفیٰؐ بے گانہ کرد

عصرِ حاضر نے ہمیں خود اپنے آپ سے بیگانہ کر دیا ہے۔ ہم پہچان ہی نہیں رہے کہ ہم کون ہیں۔ ہمارا مقام کیا ہے۔ ہم کاسۂ گدائی لے کر اقوامِ مغرب کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ ہم زندگی کے تصورات ان سے مستعار لیتے ہیں۔ ہمیں ان کی ہر ادا میں ہزار رعنائی نظر آتی ہے۔ ہم ان کی اندھی تقلید کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ عصرِ حاضر نے ہمارے ساتھ اتنا ہی نہیں کیا۔ وہ یہاں تک آگے بڑھ گیا کہ ہمیں اس راستے سے بھی بیگانہ کر دیا جس پر حضور نبیٔ اکرمؐ کے درخشندہ نقوشِ قدم تابندہ ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں اور ہر اس راہ رَو کے لئے مشعلِ راہ بنتے ہیں جو شرفِ انسانیت کی منزل تک پہنچنے کا ذوق اپنے دل میں رکھتا ہو۔ ہماری یہ محرومی سب سے بڑی محرومی ہے۔ یاد رکھئے۔

سوزِ اُو تا از میانِ سینہ رفت
جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت

جب ہمارے دلوں سے ایمان کی وہ حرارت جاتی رہی جو حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کو بطور اُسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھنے سے پیدا ہو سکتی ہے تو ہمارے دل کا آئینہ آئینہ نہ رہا، پتھر کا ٹکڑا بن گیا۔

باطنِ ایں عصر را نشناختی
داوِ اول خویش را در باختی

تو تہذیبِ مغرب کی ظاہری چمک دمک سے فریب کھا گیا اور ان نگاہ فریب پردوں کو اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکا کہ تجھے نظر آجاتا کہ اس میں کس قدر تاریکیاں ہیں۔ یہ فریب اتنا بڑا تھا کہ تو نے اپنی ساری متاعِ حیات پہلے ہی داؤ میں ہار دی۔

تا دماغِ تو بہ پیچاکش فتاد
آرزوئے زندہ در دل نزاد

جب تیری فکر تعلیمِ مغرب کے پھندے میں پھنس گئی تو تیرے دل میں کوئی زندہ آرزو پیدا نہ ہوئی۔

احتسابِ خویشتن کن از خود مرو
یک دو دم از غیرِ خود بیگانہ شو

اپنی ہستی کو پہچان، اپنا محاسبہ کر۔ تھوڑے سے وقت کے لئے مغرب سے مستعار لئے ہوئے افکار و تخیلات کو جھٹک کر الگ کر دے۔ اور یوں خالی الذہن ہو کر سوچ کہ تو کیا تھا اور کیا بن گیا۔

افرنگ زخود بے خبرت کرد، وگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

اپنی ہستی سے بیگانہ ہو جانے کا نتیجہ ہے کہ تجھے اپنے آپ پر اعتماد اور بھروسہ ہی نہیں رہا۔

تا کجا ایں خوف و وسواس و ہراس
اندر ایں کشور مقامِ خود شناس

تیرا دل خوف اور ہراس کا مسکن اور شکوک و وساوس کا مامن بن رہا ہے۔

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اس یقین کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو کائنات میں اپنے مقام سے آشنا ہو جائے گا۔

ایں چمن دارد بسے شاخِ بلند
بر نگوں شاخِ آشیانِ خود مبند

چمنِ کائنات میں بڑے بڑے تناور درخت ہیں تو انہیں چھوڑ کر اپنا آشیانہ ان شاخوں پر کیوں بناتا ہے جو جھک کر زمین کے ساتھ لگ رہی ہیں۔ تیرا مقام تو بہت بلند ہے۔

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اس لئے تونے اپنے آپ کو اس قدر پستی پر کیوں رکھ چھوڑا ہے کہ جس کا جی چاہے جھپٹا مار کر تجھے شکار کرلے.

نغمہ داری در گلو اے بے خبر
جنسِ خود بشناس و با زاغاں مپر

تیرے گلے میں بُلبُل کا سا نغمہ اور کوئل کی سی موسیقی ہے. لیکن تُونے اپنے آپ کو کوّا سمجھ رکھا ہے. تو اپنے آپ کو پہچان اور کوّوں سے الگ ہوجا.

خویشتن را تیزیٔ شمشیر دہ
باز خود را در کفِ تقدیر دہ

تجھے علم ہی نہیں کہ

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے

تو اپنے اندر تلوار کی سی سختی اور تیزی پیدا کر. اور اس کے بعد اس تلوار کو تقدیرِ خداوندی کے ہاتھ میں دے دے کہ وہ اس سے باطل کی رگِ جاں کو کاٹ کر الگ کردے. "مومن خدا کے ہاتھ میں شمشیر کی مانند ہے" یہی قرآن کی تعلیم ہے. خدا کا ہر پروگرام جسے وہ انسانی دنیا میں کارفرما کرنا چاہتا ہے، اس کی تکمیل انسانی ہاتھوں سے ہوتی ہے. مومن کا یہی مقام ہے اور یہی مصرف ہے.

اندرونِ تست سیلِ بے پناہ
پیشِ اُو کوہِ گراں مانندِ کاہ

تو اپنی پوشیدہ قوّتوں سے واقف نہیں. تیرے اندر قوّتوں کا طوفانِ بے پناہ پوشیدہ ہے. ایسا طوفاں جس کے سامنے پہاڑ کی حیثیت ایک پرِ کاہ جیسی ہے.

سیل را تمکیں ز ناآسودن است
یک نفس آسودنش نابودن است

طوفان اسی وقت تک طوفان ہے جب تک وہ متحرّک اور متلاطم ہے. اگر وہ ایک ثانیہ کے لئے بھی متحرّک سے ساکن ہوجائے، تو وہ طوفان نہیں رہتا.

من نہ مُلّا ، نے فقیہہِ نکتہ ور نے مرا از فقر و درویشی خبر
در رہِ دیں تیز بین و سُست گام پختہ ، من خام و کارم ناتمام

میں نہ مُلّا ہوں نہ فقیہہ۔ نہ مجھے فقر و درویشی کی کچھ خبر ہے. جہاں تک دین کا تعلق ہے اس میں بھی یہ کیفیت ہے کہ نگاہ تو بے شک بہت تیز رکھتا ہوں لیکن عمل کی قوت بہت کم پائی ہے. میری جس فکر کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ بہت پختہ ہے وہ درحقیقت ہنوز خام ہے. میرے جس کام کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ مکمل ہو گیا وہ ناتمام ہوتا ہے. یہ میری حالت ہے. لیکن

تا دلِ پُر اضطرابم دادہ اند
یک گرہ از صد گرہ بکشادہ اند

اتنی بات ضرور ہے کہ میرے سینے میں ایسا دل ہے جو ملّت کے درد سے لبریز ہے. وہ ہر وقت مضطرب و بیتاب رہتا ہے اور میری فکر کی سو گرہوں میں سے ایک گرہ کھل چکی ہے. بس یہ ہے میری متاعِ قلب و دماغ.

"از تب و تابم نصیبِ خود بگیر
بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر"

تم میری اس تپش و خلش سے کچھ حصّہ لے لو۔ اس دَور میں اتنا بھی غنیمت سمجھو اس لئے کہ میرے بعد مجھ جیسا مردِ فقیر کبھی نہیں آئے گا.

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

باب نمبر ۸

مردِ حُر

اس سے پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ قرآنی فقر اور غیر قرآنی فقر میں فرق کیا ہے، زیرِ نظر کو اس موضوع کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے. اس میں قرآنی فقر کے حامل کو

مردِ حُر

سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی خصوصیات یہ بتائی گئی ہیں کہ

مردِ حُر محکم ز وردِ لَا تَخَفْ
ما بہ میداں سر بجیب، اُو سر بکف

مردِ آزاد، یعنی بندۂ مومن کا دل خوف و ہراس سے خالی ہوتا ہے. وہ کسی سے نہیں ڈرتا. جب حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ ساحرینِ دربارِ فرعون سے ہوا تو اگرچہ قوّت و سطوت کا ہر سامان فریقِ مخالف کے پاس تھا. اور حضرت موسیٰؑ کے پاس اپنے دعویٰ حق و صداقت کی تائید میں صرف دلائل و براہین تھے. لیکن عین مقابلہ کے وقت ان سے کہا گیا کہ

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (۲/۶۸)

مت خوف کھاؤ. تم ان پر غالب آکر رہو گے.

ہم میں اور مردِ حُر میں فرق یہ ہے کہ ہم مصافِ زندگی میں سوچ بچار میں پڑے رہتے ہیں کہ ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا اور وہ سر بکف دشمن کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آتا ہے. اس کی جرأتیں بے باک اور حوصلے نہایت بلند ہوتے ہیں.

مردِ حُر از لَآ اِلٰہ روشن ضمیر
می نہ گردد بندۂ سلطان و میر

وہ اس لئے کسی سے نہیں ڈرتا کہ اس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ دنیا میں اقتدار و اختیار کا مالک صرف خدا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی محکومی نہیں اختیار کی جاسکتی۔ اطاعت صرف اس کے قوانین کی، کی جاسکتی ہے۔ اور بس۔ اس لئے وہ نہ صاحبِ قوّت بادشاہوں کے سامنے جھکتا ہے، نہ دولت کے مالک، سرمایہ داروں سے غم کھاتا ہے۔ وہ دنیا کی ہر بڑی آستاں سے سرفرازانہ گزر جاتا ہے۔

مردِ حُر چوں اشتراں بارے برد
مردِ حُر بارے بُرد خارے خورد

اس کی اس جرأت و بیباکی کا راز اس میں ہے کہ وہ خلقِ خدا کی خدمت کرتا ہے۔ ان کی ذمہ داریاں اپنے سر لیتا ہے۔ ضرورتمندوں اور محتاجوں کا بوجھ اٹھاتا ہے اور اس کے معاوضہ میں ان سے کچھ نہیں مانگتا۔ وہ اپنا گزارہ نہایت معمولی سامانِ زیست سے کرلیتا ہے جس طرح اونٹ کہ اس قدر بوجھ اٹھاتا ہے لیکن اس کے بعد اپنا پیٹ جنگل کی خار دار جھاڑیوں سے بھر لیتا ہے۔ مردِ حُر کا یہی قلندرانہ اندازِ زندگی ہے جو اسے ہر چوکھٹ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

پھر اونٹ ہی کی طرح اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

پائے خود را آں چناں محکم نہد
نبضِ رہ از سوزِ اُو بر می جہد

وہ سفرِ زندگی میں نہایت استقلال اور استقامت سے جادہ پیما ہوتا ہے۔ اس کے قدم میں کسی مقام پر بھی لغزش نہیں آتی۔ وہ اپنا قدم جہاں رکھتا ہے جما کر رکھتا ہے۔ اس طرح جما کر کہ اس کی گرمی سے راستے کی نبض میں تڑپ پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ جن راہوں سے گزر جاتا ہے ان میں بھی حرکت و حرارت دوڑنے لگ جاتی ہے۔

جانِ اُو پایندہ تر گردد ز موت
بانگِ تکبیرش بروں از حرف و صوت

وہ جب راہِ حق میں جان دے دیتا ہے تو اس سے اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوجاتا۔ اس سے صرف اس

کا طبیعی جسم مرتا ہے۔ اس کی ذات حیاتِ جاوداں کی پیکر بن کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ وہ جب میدانِ جنگ میں نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہے تو اس کا یہ نعرہ' الفاظ اور آواز کا رہینِ منت نہیں ہوتا۔ یہ اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے اور خاموشی ہی خاموشی سے ساری فضا کو متأثر کر جاتا ہے۔ اس کا عملِ خاموش اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کائنات میں غلبہ و اقتدار کی مالک صرف خدا کی ذات ہے۔ اس سے بلند و برتر کوئی نہیں (اللہ اکبر)۔

ہر کہ سنگِ راہ را داند زجاج
گیرد آں درویش از سلطاں خراج

جس مردِ آزاد کی یہ کیفیت ہو کہ سفرِ حیات میں اس کے سامنے جو مشکلات آئیں وہ انہیں ہیچ جانے۔ ہر سنگِ راہ اس کے پاؤں کے نیچے' کانچ کی طرح چورہ چورہ ہو جائے۔ اس کی قوتوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ درویش ہوتے ہوئے بادشاہوں سے خراج حاصل کرتا ہے۔ بڑی سے بڑی قوتوں کے مالک شاہنشاہ اس کے سامنے جھکتے ہیں۔

گرمیٔ طبعِ تو از صہبائے اُوست
جوئے تو پروردۂ دریائے اُوست

حضرت علامہؒ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تمہاری تاریخ میں جہاں کہیں حرکت و حرارت کے آثار نظر آتے ہیں یہ انہی مردانِ حُر کے عملِ حیات بخش کا نتیجہ ہے جنہوں نے دنیا میں خدائی حکومت کو قائم کیا۔ یہ جو مسلم ممالک میں ابھی تک یہاں' وہاں کچھ زندگی کی ندیاں دکھائی دیتی ہیں' ان سب کی پرورش انہی کے دریائے ایمان و عمل سے ہو رہی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے مردانِ حُر' قدوسیوں کی اس جماعت کے (۴۸/۲۹) جملہ افراد تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کے رفقاء کہہ کر پکارا ہے (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ) لیکن اگر آپ بات سمجھنے کے لئے ان میں سے کسی ایک کا محسوس کردار سامنے رکھنا چاہیں تو حضرت عمرؓ کی سیرت کو سامنے لائیے' آپ کو اس میں اقبالؒ کے مردِ حُر کی ایک ایک خصوصیت جگمگاتی نظر آئے گی۔

پادشاہاں در قبا ہائے حریر
زرد رُو از سہمِ آں عریاں فقیر

اس مردِ آزاد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے کُرتے میں بیسیوں پیوند لگے ہوئے ہیں، لیکن اس کے دبدبہ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شاہنشاہ اس کے تصوّر سے کانپتے رہتے ہیں.

سرِّ دیں ما را خبر، اُو را نظر
اُو درونِ خانہ، ما بیرونِ در

ہم رموزِ دیں کو محض ذہنی طور پر حاصل کرتے ہیں. لیکن چونکہ اس کی زندگی دین کے قالب میں ڈھلی ہوتی ہے اس لئے وہ ان حقائق کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھ لیتا ہے. یوں سمجھئے کہ گویا وہ گھر کے اندر ہوتا ہے اور ہم اس کا طواف باہر سے کر رہے ہوتے ہیں. آپ دیکھیں گے کہ اس عہدِ مبارک و مسعود میں، نہ کہیں فلسفیانہ موشگافیاں تھیں نہ منطقیانہ نکات آفرینیاں. وہاں دین کے مقاصد کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ لینے کے بعد ان کے حصول کے لئے پیہم جدّوجہد میں منہمک ہو جانا مقصودِ حیات تھا.

اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز باغباں
بُلبل چہ گفت و گُل چہ شنید و صبا چہ کرد

ان کے ایمان کی شہادت، ان کے اعمال کے زندہ و پائندہ، محسوس و مشہود نتائج سے ملتی تھی.

ما کلیسا دوست! ما مسجد فروش!
اُو ز دستِ مصطفیٰؐ پیمانہ نوش

ہماری کیفیت یہ ہے کہ حقیر سے مفادِ عاجلہ کے لئے دین فروشی اختیار کر لیتے ہیں. اس کے لئے کبھی عیسائیوں سے یارانہ گانٹھا جاتا ہے. کبھی یہودیوں سے پیمانِ وفا باندھا جاتا ہے. کبھی کفار کی دہلیزوں پر سر جھکایا جاتا ہے کبھی مشرکین کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کیا جاتا ہے. لیکن مردِ حُر اس پست سطح پر کبھی نہیں اترتا. وہ نبیِؐ اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتا ہے اور اس کے رنگ میں ایسا رنگا جاتا ہے کہ وہ غیروں کے سامنے کبھی سر نہیں جھکاتا.

نے مغاں را بندہ، نے ساغر بدست
ما تہی پیمانہ، اُو مستِ الست

وہ کبھی خالی پیمانہ ہاتھ میں لے کر، عجمی شراب خانوں سے، غیر قرآنی تصوّرات و نظریات کی گدائی نہیں کرتا.
وہ قرآنی حقائقِ زندگی سے مست ہوتا ہے اس لئے اسے کسی سے کچھ مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہوتی.

چہرۂ گل از نمِ اُو احمر است
ز آتشِ ما دُودِ اُو روشن تر است

اس کی زندگی کا مقصد، اپنی انفرادی نجات اور "روحانی ترقی" نہیں ہوتا۔ وہ حُسنِ کائنات میں اضافہ کرتا اور دوسرے انسانوں کی زندگیاں سنوارتا ہے۔ وہ ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں اس کی محنت، دوسروں کی پرورش اور نشوونما کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں کا دھواں، ہمارے ہاں کی آگ سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔

دارد اندر سینہ تکبیرِ اُمم
در جبینِ اُوست تقدیرِ اُمم

وہ خود ہی زندہ نہیں ہوتا اس کے حرکت و عمل سے، قوموں کی قومیں، حیاتِ نَو سے ہم آغوش ہوجاتی ہیں۔ اقوامِ عالم کی تقدیر، اس کی پیشانی میں جھلکتی ہے۔ وہ زمانے کے دھارے کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ وہ قوموں کی تقدیریں بدل دیتا ہے۔

قبلۂ ما گہ کلیسا، گاہ دَیر
اُو نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر

ہم محض روٹی کی خاطر، کبھی دنیا کی ایک طاقت کو اپنا قبلہ مقصود قرار دیتے ہیں، کبھی دوسروں کو، کبھی انگریز کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں، کبھی ہندو کے، لیکن مردِ حُر ان میں سے کسی کے سامنے بھی جھولی نہیں پھیلاتا۔ وہ اپنا رزق آپ پیدا کرتا ہے۔ اس لئے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔

ما ہمہ عبدِ فرنگ اُو عبدہٗ
اُو نہ گنجد در جہانِ رنگ و بُو

ہم سب انگریز کے غلام ہیں۔ لیکن مردِ حُر صرف ایک اللہ کا غلام ہوتا ہے۔ اس کی قلب کی وسعتوں کے سامنے یہ ساری مادی کائنات ہیچ اور تنگ ہوجاتی ہے۔ وہ پہنائے عالم کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ خود اس کے اندر گم نہیں ہوتا۔

صبح و شامِ ما بہ فکرِ ساز و برگ
آخرِ ما چیست؟ تلخیہائے مرگ

ہماری ساری زندگی محض اپنی طبیعی ضروریات کے حصول کی تگ ودَو میں صرف ہو جاتی ہے۔ یہی ہماری زندگی کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب مقصود و منتہیٰ محض طبیعی زندگی ہو تو اس کا انجام موت کی تلخی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

در جہانِ بے ثبات اُو را ثبات
مرگِ اُو را از مقاماتِ حیات

یہ مادّی کائنات اور خود انسان کی طبیعی زندگی ہر آن بدلتی اور فنا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن مردِ آزاد کی ذات، ان تغیرات سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔ وہ حیاتِ جاوید کی حامل بن جاتی ہے، جسے ہم موت کہتے ہیں۔ وہ اس کے لئے زندگی کے مختلف مراحل میں سے ایک مرحلہ ہوتا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ

موت، اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اس کی زندگی اس طرح ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

اہلِ دل از صحبتِ ما مضمحل
گل ز فیضِ صحبتش دارائے دِل

ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم کچھ وقت کے لئے ہمارے پاس بیٹھ جائے تو افسردہ خاطر اُٹھے۔ اور مردِ حُر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ محض آب و گل کا پیکرِ انسان، اس کی صحبت سے ایسا جاذب بن جائے کہ ہر ایک کا دل اس کی طرف کھینچا چلا آئے۔

کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن
اُو ہمہ کردار و کم گوید سخن

ہم چونکہ یقین کی لذت سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمارا ہر پروگرام ظن و قیاس پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ باتیں کم کرتا ہے، کام زیادہ کرتا ہے۔ اس کی پوری زندگی عملِ مسلسل اور سعیٔ پیہم کی داستانِ حیات بخش ہوتی ہے۔

ما گدایاں، کوچہ گرد و فاقہ مست
فقرِ اُو از لَآ اِلٰہ تیغے بدست

ہم ساری عمر بھک منگوں کی طرح ذلیل و خوار رہتے ہیں۔ وہ کاسۂ گدائی کی جگہ شمشیر بدست باہر نکلتا ہے اور خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا۔

ما بہ رِ کاہے اسیرِ گرد باد
ضربش از کوہِ گراں جوئے کشاد

ہماری کیفیت، خس و خاشاک کی سی ہے جیسے ہوا کا ہر تُند و تیز جھونکا جدھر چاہے اُڑا اُڑا کے اُڑلئے پھرے۔ اور اس کی قوتوں کا یہ عالم کہ اس کی ایک ضرب، پہاڑ سے جوئے شیر نکال کرلے آئے۔

ہزار چشمے ترے سنگِ راہ سے پھوٹیں
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

یہ ہے وہ مردِ حُر کہ

محرمِ اُو شو، ز ما بے گانہ شو
خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

تو ہمارے پاس بیٹھ کر کیا کرے گا۔ جا کسی ایسے مردِ حُر کی صحبت میں بیٹھ اور اس سے ان حقائق کو سیکھ جس سے زندگی پہاڑ کی طرح محکم ہو جاتی ہے۔ اس کی ہدایت کے مطابق ہر قسم کی قربانی کر دے۔ اور اس کے بعد دیکھ کہ تجھے دنیا میں کیا کچھ نہیں ملتا!

شکوہ کم کن از سپہرِ گرد گرد
زندہ شو از صحبتِ آں زندہ مرد

اس وقت تمہاری یہ حالت کہ تم ہر وقت تقدیر کا رونا روتے رہتے ہو۔ ہر سانس میں فلک ناہنجار کے شکوے کرتے رہتے ہو۔ یہ اس لئے کہ تم زندگی سے عاری ہو۔ تم اس مردِ حُر کے پاس بیٹھو تاکہ تم میں زندگی بیدار ہو جائے۔ اور پھر تم تقدیر کے شکوے کبھی نہ کرو۔ تمہاری تقدیر خود تمہارے ہاتھ میں ہے۔ بشرطیکہ تم زندہ انسان ہو۔ مٹی کے تودے نہ ہو۔

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر آدم گر است

کتابی علم سے مردِ حُر کی صحبت کہیں بہتر ہے کہ اس کی صحبت میں انسانیت سازی ہوتی ہے۔

مردِ حُر دریائے ژرف و بیکراں
آب گیر از بحر و نے از ناوداں

مردِ حُر کے علم کی گہرائیاں اور وسعتیں، حدود فراموش ہوتی ہیں. علم حاصل کرنا ہے تو اس سے حاصل کر. یہ لوگ جنہیں "عالم" کہا جاتا ہے ان کا علم پرنالے کا پانی ہے جو ہر قسم کی غلاظت اور کثافت اپنے ساتھ بہا کر لاتا ہے اس سے تم کیا حاصل کرو گے؟

سینۂ ایں مرد می جوشد چو دیگ
پیشِ اُو کوہِ گراں یک تودہ ریگ

علم کے ساتھ اس میں زندگی کی حرارت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس کا سینہ دیگ کی طرح جوش زن نظر آتا ہے اور اس کے عزم کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے بڑے سے بڑا پہاڑ ریت کے ڈھیر سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

روزِ صلح آں برگ و سازِ انجمن
ہم چو بادِ فرودیں اندر چمن
روزِ کیں آں محرمِ تقدیرِ خویش
گورِ خود می کند از شمشیرِ خویش

وہ حلقۂ یاراں میں ہو تو ریشم کی طرح نرم ہوتا ہے. صلح کی گفتگو ہو رہی ہو تو بادِ بہاری کی طرح، ہر سبزہ کا مُنہ چومتا اور ہر غنچہ کو پیغامِ شگفتگی دیتا ہے. اس کے برعکس جب وہ میدانِ جنگ میں ہو تو بے جگری سے لڑ کر اپنی جان دے دیتا ہے، گویا وہ اپنی تلوار سے اپنی قبر کھودتا ہے. اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹).

اے سرت گردم گریز از ما چو تیر
دامنِ اُو گیر و بے تابانہ گیر

میں تیرے قربان جاؤں. ہمارے پاس نہ بیٹھ. ہم سے کنارہ کر. جا اور جا کر اس قسم کے مردِ حُر کا دامن تھام لے اور والہانہ انداز سے اس سے وابستہ ہو جا.

می نہ روید تخمِ دل از آب و گِل
بے نگاہے از خداوندانِ دل

دل کا بیج، محض پانی اور مٹی کی آویزش سے نہیں پھوٹا کرتا۔ اس کی روئیدگی کے لئے ایک اور چیز کی بھی منت ہوتی ہے۔ یعنی ایک ایسے مردِ آزاد کی نگاہِ حیات بخش، جسے خدا کی عطا کردہ مستقل اقدارِ انسانیت سے عشق ہو۔

اندر ایں عالم نیرزی با خسے
تا نیا ویزی بداماں کسے!

یاد رکھو۔ جب تک تو اس قسم کے مردانِ حُر کا رفیقِ کار نہ بنے اس وقت تک تیری قیمت پرِ کاہ جتنی بھی نہیں۔ دین کی زندگی انفرادی نہیں، اس کے لئے جماعتِ مومنین کے ساتھ ہونا نہایت ضروری ہے۔

اسی لئے قرآن کا ارشاد ہے۔ تصوّف کی خلوت کدوں کی زندگی، جس میں اجتماعی نظام کا تصور تک نہیں، غیروں سے مستعار لیا ہوا اندازِ زیست ہے۔ اور اقبالؒ کے الفاظ میں ــ اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ــ مومن کی زندگی وہی ہے جس کا آئینہ صدیقِ اکبرؓ اور عمر فاروقؓ جیسے مردانِ حُر کا کردار ہے۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

باب نمبر ۹

در اسرارِ شریعت

دین کی اصولی حکمتیں بیان کرنے کے بعد، اب علّامہ اقبالؒ، اس کے عملی نظام کی طرف آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اسلامی معاشرہ کا نقشہ کس قسم کا ہونا چاہیئے. معاشرہ کی بنیاد معیشت (روزی) پر ہے. معیشت (رزق یا سامانِ زیست) ہی سے انسان کی طبعی زندگی قائم ہے. اور یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی موجودہ منزل میں انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ یہ زندہ رہے ــــ واضح رہے کہ بطیب خاطر، نظامِ خداوندی کے قیام اور بقا کی خاطر عند الضرورت جان دے دینا اور بات ہے اور سامانِ زیست کے نہ ملنے کی وجہ سے فاقوں سے مرجانا اور بات. چونکہ انسان کی طبعی زندگی کے لئے سامانِ زیست کا مہیّا ہونا بنیادی سوال ہے، اس لئے کہ قرآنِ کریم نے اسلام کے معاشی نظام کو نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے. ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، دین کے ارکان ہیں، انہی کو پنج بنائے اسلام کہا جاتا ہے. اگر ان کی حیثیت ارکان (اُن ستونوں) کی رہتی جن پر عمارت کی چھت ڈالی جاتی ہے تو بھی معاملہ اپنے مقام پر ٹھیک رہتا. اس طرح یہ وہ ستون قرار پاتے جن کے اسلام کے معاشی، سیاسی، معاشرتی نظام کی عمارت تعمیر ہوتی. لیکن بدقسمتی سے جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو یہی ارکان (ستون) مقصود بالذّات قرار پا جاگئے. چنانچہ اب کیفیت یہ ہے کہ ہمارے ہاں صدیوں سے ان ستونوں کو قائم کرنے پر سارا زور صرف کیا جا رہا ہے. اور ان ستونوں پر چھت ڈال کر جو عمارت تعمیر کرنی تھی اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں. یہ عقیدہ ہمارے دلوں میں اس شدّت سے راسخ ہو چکا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام کے معاشی نظام کے متعلق بات کرے تو اسے جھٹ سے کمیونسٹ قرار دے دیا جاتا ہے. جو کافر اور دہریہ کے

مترادف ہے۔ حالانکہ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ (خود ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق) جو سب سے پہلی وحی نازل ہوئی (یا جس سورۃ العلق میں یہ پہلی وحی مذکور ہے) اس میں غلط معاشی نظام کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ (۹۶/۶-۷) "اس حقیقت سے آگاہ رہو کہ جب انسان اپنے آپ کو غنی سمجھتا ہے تو وہ سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔" یعنی افراد کے پاس مال و دولت کی افراط سے وہ نشہ پیدا ہو جاتا ہے جو انسان کو سرکشی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ چونکہ معیشت پر انسان کا اوّلین دار و مدار ہے اس لئے قرآن نے معاشی نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے کی اہمیت کو شروع سے ہی واضح کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے "اسرارِ شریعت" کی ابتدا بھی معاشی نظام کی اصلاح سے کی ہے۔ چنانچہ وہ اس باب کا آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ

نکتہ ہا از پیرِ روم آموختم
خویش را در حرفِ اُو واسوختم
"مال را گر بہرِ دیں باشی حمول (رومی)
نِعْمَ مَالٌ صَالِحٌ" گوید رسولؐ

میں نے یہ نکتہ مولانا رومؒ سے سیکھا جنہوں نے کہا ہے کہ نبیٔ اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ اگر مال کو دین کے نظام کی خاطر حاصل کیا جائے تو وہ مال صالح ہے۔ اس ایک نکتہ میں اسلام کے نظامِ معیشت کی رُلم آجاتی ہے یعنی اگر مال و دولت افراد کی ہوسِ زر پرستی کا ذریعہ ہے یا اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ فرد اس مال کو جس طرح جی چاہے صرف کرے، تو یہ مال غیر صالح ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس سے اس نظام کے قائم کرنے کا کام لیا جائے جس کا مقصود تمام نوعِ انسان کی ربوبیت (نشوونما) ہے تو یہ مال صالح قرار پا جائے گا۔

گر نداری اندر ایں حکمت نظر
تو غلام و خواجۂ تو سیم و زر

لیکن اگر تو اس نکتہ کو پیشِ نظر نہ رکھے تو پھر یہی مال و دولت تیرا آقا بن جائے گا اور تو اس کا غلام۔ آپ ان لوگوں کی حالت پر غور کیجئے جن کی زندگی کا مقصد ہی مال و دولت جمع کرنا ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہوسِ زر کس طرح ان کی ناک میں نکیل ڈالے انہیں در بدر لئے پھرتی ہے اور کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔

از تہی دستاں کشادِ اُمتاں
از چنیں منعم فسادِ اُمتاں

یاد رکھو! قوموں کی تباہی، سرمایہ داری کے نظام کے ہاتھوں ہوتی ہے جس میں ملک کی دولت چند افراد کے قبضہ میں چلی جاتی ہے اور اس پر انہیں ہر قسم کا تصرّف حاصل ہوتا ہے۔ یہی نظام، اقوامِ عالم میں باہمی فساد کا موجب ہوتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں، غریب لوگ قوموں کی کامیابی کا باعث بنتے ہیں بشرطیکہ ان قوتوں کو صحیح مصرف میں لانے والے افراد اُن کے راہ نما بنیں۔

جدّت اندر چشمِ او خوار است و بس
کہنگی را اُو خریدار است و بس

اس قسم کے دولتمندوں میں یہی خرابی نہیں ہوتی کہ وہ رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں اور انہیں عوام کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ اس سے ان میں عجیب نفسیاتی تغیّرات پیدا ہوجاتے ہیں جس سے ان کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ معاشرہ میں ذراسی تبدیلی کا تصوّر ان کی رُوح میں کپکپی پیدا کردیتا ہے۔ اور جو نظامِ کہنہ متواتر چلا آتا ہے وہ اسی میں اپنی خیریت سمجھتے ہیں۔

آپ نے غور کیا کہ ہمارا مروّجہ اسلام جو ہمارے دورِ ملوکیت اور سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے اور جس کی علمبردار مذہبی پیشوائیت ہے کس طرح ہر نئی بات کو حرام قرار دیتا ہے اور جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اس کی اندھی تقلید میں نجات کا راز بتاتا ہے۔ یاد رکھئے نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا باہمی گٹھ جوڑ شروع سے چلا آرہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری کو "خدائی سند" عطا کرکے اسے عوام کی یورش سے محفوظ کر دیتی ہے، اور سرمایہ دار طبقہ، مذہبی پیشواؤں کے لئے اوقاف اور وظائف مقرر کرکے، ان کی روٹی کا انتظام کردیتا ہے۔

در نگاہش ناصواب آمد صواب
ترسد از ہنگامہ ہائے انقلاب

اس طبقہ کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ انہیں ہر برائی، بھلائی بن کر دکھائی دیتی ہے اور انقلاب کے تصوّر سے ان کی جان جاتی ہے۔

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد
آبروئے دُخترِ مزدُور بُرد

سرمایہ دار، مزدور کی محنت کا پھل کھا جاتا ہے اور اتنا ہی نہیں، قیامت یہ ہے کہ یہ کم بخت اس غریب کی بہو بیٹی کی عصمت بھی لوٹ لیتا ہے۔

در حضورش بندہ می نالد چو نَے
بر لبِ اُو نالہ ہائے پے بہ پے

زمیندار، جاگیردار، مل اور فیکٹری کے مالک، سرمایہ دار کے سامنے، غریب مزدور اپنی مصیبتیں بیان کرکے روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، چیختا ہے، چلّاتا ہے۔ لیکن اس شقی القلب کے دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

نے بجامش بادہ و نے در سبوست
کاخ ہا تعمیر کرد و خود بکوست

زمیندار کے گھر میں اناج کے انبار لگے ہوتے ہیں لیکن اس مزدور کے ہاں نہ پیالے میں پینے کا پانی، نہ مٹکے میں کھانے کے لئے آٹا ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ داروں کے لئے محلّات تعمیر کرتا ہے اور خود فٹ پاتھ پر سوتا ہے۔

اے خوش آں منعم کہ چوں درویش زیست
درچنیں عصرے خدا اندیش زیست

کس قدر خوش بخت ہے وہ دولت مند، جو پوری محنت سے دولت کماتا ہے لیکن اس میں سے اپنی ضروریات کے لئے کم از کم رکھ کر، باقی نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کے لئے قرآنی نظام کی تحویل میں دے دیتا ہے۔ اس زمانے میں جب نظامِ سرمایہ داری اتنے زوروں پر ہے، ایسی زندگی وہی بسر کر سکتا ہے جس کے دل میں قوانینِ خداوندی کا احترام ہو اور وہ اس تباہی سے خوف کھاتا ہو جو ان کی خلاف ورزی سے قوموں پر آتی ہے۔

تا ندانی نکتۂ اکلِ حلال
بر جماعت زیستن گردد وبال

جس قوم کی سمجھ میں رزقِ حلال کی اہمیت نہیں آتی، اس کے لئے زندگی وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ بظاہر دیکھئے تو اس کے ہاں مال و دولت کی بے حد فراوانی ہوگی، ہر طرح کا سامانِ عیش میسّر ہوگا۔ لیکن معاشرہ

کے اجتماعی نظام پر نگاہ ڈال لیۓ یا افراد کے دلوں میں جھانک کر دیکھئے تو ان میں جہنم کی آگ شعلہ فشاں دکھائی دے گی۔

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست
چشم اُو ینظر بنورِ اللہ نیست

اس جہنم کا محسوس منظر دیکھنا ہو تو یورپ کی اجتماعی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔ وہ رزقِ حلال کی اہمیت سے واقف نہیں، اس لئے اسے کسی آن بھی سکون اور اطمینان نصیب نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وحی کی روشنی سے محروم ہے۔ وہ زندگی کے راستوں کو قوانینِ خداوندی کی روشنی میں طے نہیں کرتا۔ اس لئے وہاں ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا ہے۔

اُو نداند از حلال و از حرام
حکمتش خام است و کارش ناتمام

وہ حرام اور حلال میں تمیز ہی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ ان باتوں کے فیصلے، تنہا عقل کی رُو سے کرتا ہے۔ جس چیز کو اس کی عقل (مصلحت) جائز قرار دیتی ہے اسے اختیار کر لیتا ہے۔ جسے وہ ناجائز (غیر سودمند) بتاتی ہے اسے چھوڑ دیتا ہے۔ حالانکہ

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ (جاویدنامہ)

واضح رہے کہ یہاں "حرام و حلال" میں تمیز کرنے سے یہ مطلب نہیں کہ وہ سؤر کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ یہ چیزیں بے شک حرام اور ناجائز ہیں۔ لیکن یہاں گفتگو ان کے اجتماعی نظامِ معیشت کی ہو رہی ہے۔ جس قوم کے ہاں یہ نظام غیر خداوندی اصولوں کے مطابق قائم ہوگا اس قوم کو رزقِ حلال نصیب ہی نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جو روپیہ غریبوں کی محنت کو غصب کر کے حاصل کیا جائے اس سے خریدا ہوا حلال بکرے کا گوشت "حلال" کہلائے گا؟ اس نکتہ کو خود حضرت علامہؒ نے واضح کر دیا ہے۔ جب کہا ہے کہ یورپ حلال و حرام میں اس لئے تمیز نہیں کر سکتا کہ ان کے نظامِ معیشت میں کیفیت یہ ہے کہ

اُمّتے بر اُمّتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد، آں حاصل بُرد

ایک قوم اپنی کھیتی سے نہیں، دوسری قوم کی کھیتی سے گھاس چرتی ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ فصل کوئی بوتا ہے اور غلّہ کوئی لے جاتا ہے۔ یہی نظامِ سرمایہ داری کی رلم ہے۔ اس نظام میں

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است
از تنِ شاں جاں ربودن حکمت است

کمزور قوموں کا رزق چھین کر اپنے ہاں لے جانا انتہائی سیاسی کاریگری کہلاتا ہے۔ ان ناتوانوں کے نحیف و زار جسم سے خون کا آخری قطرہ نچوڑ کر لے جانا، تاکہ اس سے اپنی قوم کے قصرِ تعیش کی رنگینی کا سامان بہم پہنچایا جائے ڈپلومیسی قرار پاتا ہے۔ یورپ کی ہر قوم اسی تگ و تاز میں لگی رہتی ہے اور اس کا نام "تہذیب" رکھا جاتا ہے۔

شیوۂ تہذیبِ نَو آدم دری است
پردۂ آدم دری سوداگری است

اس تہذیبِ نَو کا مسلک کیا ہے؟ انسان کو چیر پھاڑ کر کھا جانا، اور یہ تمام سبعیت اور درندگی تجارت کے پردے میں کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں اسے سوداگری، اور ہے یہ درحقیقت قزاقی اور رہزنی۔

ایں بنوک، ایں فکرِ چالاک یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود

یہ بینکس جن کے بل بوتے پر، تجارت کا یہ سارا کاروبار چلتا ہے، یورپ کی انتہائی خون آشام سرمایہ پرست، آدم خور، قومِ یہود کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ انسان کے دل سے خدا کے نور کو چھین کر لے گئے ہیں۔ اور ساری دنیا، ظلم و استبداد پر اُتر آئی ہے۔ یاد رکھو۔

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

جب تک یہ نظامِ سرمایہ داری تہ و بالا نہیں ہوتا عقل و فکر اور تہذیب و تمدّن کا تصوّر سودائے خام ہے۔ نہیں، اس سے بھی آگے چلئے۔ اس نظام کی موجودگی میں دین کا نام لینا بھی اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔

دین اور نظامِ سرمایہ داری، دو متضاد عناصر ہیں۔ ایک کی موجودگی میں دوسرا رہ نہیں۔ اگر نظامِ سرمایہ داری رائج ہے تو دین باقی نہیں رہ سکتا۔

اس کے بعد اگلا بند یوں شروع ہوتا ہے۔

آدمی اندر جہانِ خیر و شر
کم شناسد نفعِ خود را از ضرر

دنیا میں خیر و شر دونوں موجود ہیں۔ ان میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ انسان تنہا عقل کی رُو سے اضافی خیر اور شر کو تو معلوم کر سکتا ہے لیکن مطلق خیر اور شر کا معلوم کرنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ یہ وحی کی مدد کے بغیر ناممکن ہے۔ ہر فرد کی عقل اسے یہ بتائے گی کہ تیرے فائدے کی بات کون سی ہے ۔ اُسے اِس سے غرض نہیں ہوگی کہ نوعِ انسان کا فائدہ کس بات میں ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ جس بات کو ایک فرد کی عقل اس کے لئے فائدہ مند بتائے وہ بھی درحقیقت اس کے فائدے کی نہ ہو۔ ذرا آگے چل کر معلوم ہو کہ وہ فائدہ مند نہیں نقصان رساں تھی۔ جو کیفیت افراد کی ہے وہی اقوام کی ہے۔

کس نداند زشت و خوبِ کار چیست
جادۂ ہموار و ناہموار چیست

وحی کی روشنی کے بغیر کوئی نہیں جان سکتا کہ کاروانِ انسانیت کے لئے وہ صحیح راستہ کون سا ہے جو اسے اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ چیز صرف شریعتِ حقہ (دینِ خداوندی) کی رُو ہی سے ممکن ہے جس کا سرچشمہ عقلِ انسانی سے ماورا ہے۔

شرع برخیزد ز اعماقِ حیات
روشن از نورش ظلامِ کائنات

وحی کی ماہیت کے متعلق غیر از نبی کچھ نہیں جان سکتا۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ وحی، خدا کی طرف سے نبی پر نازل ہوتی ہے۔ وحی علمِ خداوندی پر مبنی ہے۔ اس کا سرچشمہ وہی ہے۔ علّامہ اقبالؒ اسے (اپنے فلسفیانہ انداز میں) یوں تعبیر کرتے ہیں کہ وحی کا سرچشمہ "حیات کی گہرائیاں" ہیں۔ اسی کو وہ ضربِ کلیم میں یوں بیان کرتے ہیں کہ رازِ زندگی معلوم نہیں ہو سکتا۔

اگر حیات آپ نہ ہو شارعِ اسرارِ حیات

ہم ان فلسفیانہ بحثوں میں نہیں پڑنا چاہتے کیونکہ ہمارا مخاطب طبقہ بیشتر وہ ہے جو ان مباحث سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہم یوں کہیں گے کہ وحی کا سرچشمہ وہ ذاتِ خداوندی ہے جو خود حیات کا بھی سرچشمہ ہے۔ وحی سے کائنات کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور زندگی کے راستے روشن ہو جاتے ہیں۔

گر جہاں داند حرامش را حرام
تا قیامت پختہ ماند ایں نظام

اگر نوعِ انسانی، وحی کو جائز و ناجائز اور حرام و حلال کا معیار قرار دے لے تو اس کے مطابق جو نظامِ زندگی قائم ہو وہ ہمیشہ کے لئے زندہ و پائندہ رہے۔ لیکن

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر
با نگاہے دیگرے اُو را نگر

یہ نظام کیا ہے؟ اس کے بنیادی خط و خال کون سے ہیں۔ یہ کس طرح قائم ہوگا۔ یہ باتیں اہلِ فقہ سے پوچھنے کی نہیں۔ ہماری فقہ، عباسیوں کے دورِ ملوکیت میں قائم ہوئی۔ جس میں سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کا غلبہ تھا۔ جو قوانین اس دور میں وضع ہوئے، وہ ہمیں کیا بتا سکیں گے کہ قرآنی نظام کیا ہے؟ اس لئے کہ قرآنی نظام تو ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کو مٹانے کیلئے آیا تھا۔ اس نظام کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس دَور سے پیچھے ہٹ کر عہدِ نبیِ اکرمؐ کی طرف جانا ہوگا۔

اس حقیقت کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ انسانیت کی نجات کا راز اس نظام کے قیام میں پوشیدہ ہے جسے قرآنِ کریم نے تجویز کیا ہے اس سلسلہ میں اقبالؒ نے بتایا تھا کہ یہ مسئلہ صرف قانون سازی (فقہ) کا نہیں۔ ویسے بھی قانون (فقہ) اپنے صحیح نتائج اسی صورت میں مرتب کر سکتا ہے جب اس کا احترام اس قوم کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ قانونِ خداوندی کی صداقت پر ایمان ہی نتائج پیدا کرتا ہے۔ قانون پر محض میکانکی طور پر عمل، انسان میں داخلی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ نیست ایں کارِ فقیہاں سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے۔

حکمش از عدل است و تسلیم و رضاست
بیخ اُو اندر ضمیرِ مصطفیٰؐ است

اس نظامِ (خداوندی) کا قانون، سرتاپا عدل پر مبنی ہے۔ باقی رہا اس پر عمل کرنا۔ تو صحیح عمل کے معنی یہ ہوں گے کہ اس شخص کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی محسوس نہ ہو ـــــ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ

اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۴/۶۵). کامل تسلیم و رضا کا یہ وہ شجرِ طیّب ہے جس کی جڑ قلبِ مصطفویؐ میں پیوست ہے۔

اس کے بعد دو اشعار، مضمون کے تسلسل سے ہٹ کر آئے ہیں۔ اس میں حضرت علامہؒ نے اہلِ تصوّف سے کہا ہے کہ تم "خدا کے وصال" کے طالب رہتے ہو۔ انسان کا خدا سے وصال ناممکن ہے۔ اگر خدا کسی کے سامنے بے حجاب آجائے تو وہ (جس کے سامنے اس طرح خدا آجائے) خود باقی ہی نہ رہے۔ لہٰذا یہ مسلک صحیح نہیں ہمیں وصالِ خداوندی کا نہیں بلکہ رضائے خداوندی کا طالب رہنا چاہیئے۔ اشعار یہ ہیں۔

از فراق است آرزو ہا سینہ تاب
تو نمانی چوں شود 'اُو' بے حجاب
از جدائی گرچہ جاں آید بلب
وصلِ 'اُو' کم جو رضائے 'اُو' طلب

اس کے بعد مضمون کے تسلسل میں ہے۔

مصطفےؐ داد از رضائے 'اُو' خبر
نیست در احکامِ دیں چیزے دگر

خدا نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اپنے لئے اختیار کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خدا نے، بوساطت رسالتِ محمدیہؐ یہ بھی بتا دیا کہ سچّا راستہ کون سا ہے۔ اور یہ کہ خدا چاہتا یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی سے اسی راستے کو اختیار کرے۔ اسی کا نام خدا کی رضا طلبی ہے، کائنات میں ہر شے وہ کچھ کرتی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ایسا اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوراً کرتی ہے۔ اشیائے کائنات کو اختیار و ارادہ دیا ہی نہیں گیا۔ انسان سے کہا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے وہ کچھ کرے جو خدا چاہتا ہے۔ وحی کی رُو سے دیے گئے قوانینِ خداوندی یہ بتاتے ہیں کہ خدا، انسان سے کیا چاہتا ہے۔ دین کے احکام کی یہی رلم ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کون سا راستہ منشائے خداوندی کے مطابق ہے۔

تختِ جم پوشیدہ زیرِ بوریا است
فقر و شاہی از مقاماتِ رضا است

اسلام خانقاہیت نہیں سکھاتا۔ وہ حکمرانی سکھاتا ہے۔ لیکن اس کی حکمرانی اس لئے نہیں کہ صاحبِ حکومت فرد یا

طبقہ غریبوں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرے۔ وہ حکمرانی اس لئے ہے کہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے بڑے ایثار کی ضرورت ہوگی۔ اس نظام کا سربراہ، اس ایثار کی مثال پہلے خود قائم کرے گا۔ یوں حکمرانی بھی منشائے خداوندی کے مطابق ہوگی۔ اگر شاہی اور فقیری میں اس قسم کا امتزاج نہ ہو تو نہ شاہی منشائے خداوندی کے مطابق ہوتی ہے نہ فقیری۔ وہ شاہی چنگیزیت بن جاتی ہے اور فقیری مسلکِ خانقاہیت کی مظہر جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔

حکمِ سلطاں گیر و از حکمش منال
روزِ میداں نیست روزِ قیل و قال

جب اس قسم کا نظام قائم ہو جائے (جسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے) تو افرادِ معاشرہ کا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ امیر کی اطاعت بلا چون و چرا کریں۔ اس نظام میں زندگی ایک مسلسل جہاد بن جاتی ہے جس میں ہر آن مخالف قوتوں سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر فوج کے سپاہی میدانِ جنگ میں اپنے کمانڈر کے حکم کے خلاف بحث و تمحیص شروع کر دیں تو اس فوج کو ہر میدان میں شکست ہوگی۔ اسلامی نظام کا امیر احکامِ خداوندی ہی کی اطاعت کرتا ہے۔ اس لئے

تا توانی گردن از حکمش مپیچ
تا نہ پیچد گردن از حکمِ تو ہیچ

تم اس کے حکم سے سرکشی نہ برتو۔ تمہاری اس اطاعت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ باطل کی ہر قوت تمہارے سامنے جھک جائے گی۔

از شریعت اَحْسَنُ التَّقْوِیْم شو
وارثِ ایمانِ ابراہیمؑ شو

اس طرح احکامِ شریعت کی پابندی سے اپنی ذات کی نشوونما کا سامان پیدا کئے جاؤ۔ تم جس قدر زیادہ اطاعت گزار ہوگے اسی قدر تمہاری ذات کی وسعتیں بڑھ جائیں گی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) کے یہی معنی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں پابندئ حدود کی تاکید اس لئے کرتا ہے کہ اس پابندی سے تمہاری ذات میں وسعت پیدا ہو جائے گی۔

می شود از جبر پیدا اختیار

یہی وہ مقامِ ابراہیمیؑ ہے جسے حاصل کرنے کی تلقین ہر مومن کو کی گئی ہے۔

○

علامہ اقبالؒ نے تصوّف کو اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودے سے تعبیر کیا تھا۔ یہ بہت بڑی حقیقت تھی جسے انہوں نے اس طرح واشگاف کیا۔ آیندہ بند میں وہ اربابِ تصوّف سے کہتے ہیں کہ جس چیز کو تم طریقت کہتے ہو' وہ طریقت نہیں۔ طریقت[1] سے مراد صرف یہ ہے کہ انسان احکامِ شریعت کی غرض وغایت اور منتہٰی و مقصود کو اس طرح اپنالے کہ وہ اس کے لئے عینِ حیات بن جائے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہوجائے گی تو انسان ان احکام کو کہیں خارج سے عائد شدہ خیال نہیں کرے گا' بلکہ وہ محسوس کرے گا کہ وہ اس کے دل کی آواز اور تقاضائے حیات ہیں۔ جس طرح (مثلاً) جب انسان کو پیاس لگتی ہے اور وہ پانی پیتا ہے تو وہ کسی خارج سے عائد شدہ حکم کی تعمیل نہیں کرتا بلکہ اپنے اندرونی تقاضے کی تشکیل کا سامان فراہم کرتا ہے۔ خارج سے عائد شدہ احکام کی پابندی مجبوری کہلاتی ہے۔ لیکن خود اپنے اندرونی تقاضے کی تعمیل مجبوری نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ

پس طریقت چیست اے والاصفات
شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات
فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں
جُز بہ اعماقِ ضمیرِ خود مبیں
گر نہ بینی' دینِ تو مجبوری است
ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است

آخری شعر میں کتنی عظیم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر دین کے احکام کی تعمیل محض رسمی طور پر کی جائے تو اس سے "قربِ خداوندی" حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس سے انسان' خدا سے بہت دور رہتا ہے۔ مسلمان صدیوں سے یہی کچھ کر رہا ہے اور دن بدن خدا سے دور ہوتا چلا جارہا ہے۔

"انسان صاحبِ اختیار ہے یا مجبور"۔۔۔ یہ سوال فلسفہ کی دنیا میں شروع سے مابہ النزاع چلا آرہا ہے

---

[1] طریقت کا لفظ قرآن میں نہیں آیا۔ اسلام میں اس قسم کی اصطلاحات دوسروں سے مستعار لی گئی ہیں۔

اور متکلّمین کے ہاں سے اس کا آج تک کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل سکا. علاّمہؒ کے نزدیک اس کی وجہ ہے کہ

بندہ تا حق را نہ بیند آشکار
بر نمی آید ز جبر و اختیار

انسان جب تک حق وصداقت کو یوں بے پردہ نہ دیکھ لے جس طرح اوپر کہا گیا ہے. یعنی وہ وحی کے احکام کو اپنی زندگی کا تقاضا نہ محسوس کرے ــ تو وہ "جبر و اختیار" کی اُلجھن سے کبھی نہیں نکل سکتا. جب ان احکام کی پابندی اس کے دل کی آواز بن جائے گی تو وہ دیکھ لے گا کہ جبر اور اختیار کی حدود کیا ہیں اور کس طرح جبر سے اختیار پیدا ہو جاتا ہے.

تو یکے در فطرتِ خود غوطہ زن
مردِ حق شو بر ظن و تخمین متن
تا بہ بینی زشت و خوبِ کار چیست
اندر این نُہ پردۂ اسرار چیست

علاّمہ نے یہاں "فطرت" کا لفظ استعمال کیا ہے. ہمارے نزدیک انسان کی فطرت کچھ نہیں. "فطرت" مجبور چیزوں کی ہوتی ہے. صاحبِ اختیار کی فطرت نہیں ہوتی. اس میں کچھ صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کے متعلق اسے اختیار دیا جاتا ہے، وہ انہیں جس طرح چاہے اختیار کرے. لہٰذا یہاں فطرت سے مراد دل کی گہرائی ہی ہو سکتی ہے جب انسان، وحی کے احکام کی لِم اور غایت کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرے گا تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ خیر کیا ہے اور شر کیا. اور یوں کائنات کے مستور راز اس پر بے نقاب ہو جائیں گے.

ہر کہ از سرِّ نبی گیرد نصیب
ہم بہ جبریلِ امیں گردد قریب

جو شخص اس طرح قرآنی بصیرت سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے. وہ "ہما بہ جبریل امین" بن جاتا ہے. یعنی وحی کے اسرار و رموز سے آگاہ.

اس کے بعد حضرت علاّمہؒ پھر اربابِ تصوّف کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ می باشی مقیم

درجہاں اسرارِ دیں را فاش کن
نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

تم لوگ قرآن پر بڑا ناز کرتے ہو ۔ بلکہ کہتے یہ ہو کہ ۔ من ز قرآن مغز را برداشتیم ۔ قرآن کی اصل غرض و غایت تمہاری ہی سمجھ میں آئی ہے ۔ لیکن تمہاری روشِ زندگی یہ ہے کہ تم حجروں میں بیٹھے "سلوک کی منزلیں" طے کرتے ہو ؟ ۔ کیا قرآن کی رُو سے زندگی کا مقصد یہی ہے ۔ تم ان حجروں سے باہر نکلو اور دنیا میں دین کا نقطۂ ماسکہ اور شریعت کا منتہٰی و مقصود واشگاف کرو ۔

دین کا نقطۂ ماسکہ اور شریعت کا مقصود و منتہٰی کیا ہے ؟ اسے حضرت علامہؒ نے ایک مصرع میں بیان کر دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قدر جامع و مانع ہے کہ اس پر کچھ اضافہ نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ نقطہ یہ ہے کہ

کس نہ گردد درجہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

"دنیا میں کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ رہے ۔" بس یہ ہے شریعت کا منتہٰی ۔ اور یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے کہ دنیا میں اسلامی نظام متشکل ہو جائے ۔ دین کی ساری غایت یہ تھی ۔ لیکن

مکتب و مُلّا سخن ہا ساختند
مومناں این نکتہ را نشناختند

دین کی علم تو یہ تھی ، لیکن ملّا نے مسلمان کو عجیب عجیب باتوں میں اُلجھا دیا ۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان کی نگاہ سے دین کی یہ اصل و غایت ہی اوجھل ہو گئی ۔ اور وہ بھی حقیقت کو چھوڑ کر افسانوں کے پیچھے لگ گیا ۔ یہ یوں ہوا کہ

زندہ قومے بود از تاویل مُرد
آتشِ اُو در ضمیرِ اُو فسُرد

جب قرآن کی حقیقی تعلیم اس کے سامنے تھی تو یہ ایک زندہ قوم تھی لیکن جب مُلّا نے قرآن کی اس تعلیم کو تاویلات کے پردوں میں چھپا دیا تو وہی قوم راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ۔

صوفیانِ باصفا را دیدہ ام
شیخِ مکتب را نکو سنجیدہ ام

میں نے صوفیائے کرام کو بھی دیکھا ہے اور علمائے عظام کو بھی۔

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید
آں کہ در قرآں بغیر از خود ندید

حتیٰ کہ ہمارے زمانے میں ایک "پیغمبر" (میرزا صاحب) بھی پیدا ہو گئے ـــ ان کی کیفیت یہ تھی کہ انہیں قرآن میں اپنے تذکرہ کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

ہر یکے دانائے قرآن و خبر
در شریعت کم سواد و کم نظر

ان میں سے ہر ایک کی کیفیت یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کے عالم ہونے کے مدعی ہیں۔ لیکن حرام جو ان میں سے کسی کو معلوم ہو کہ شریعت کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ بڑے کوتاہ نگاہ، بڑے کور ذوق!

عقل و نقل افتادہ در بندِ ہوس
منبرِ شاں منبرِ کاک است و بس

ان کے ہاں روایت ہو یا درایت، سب سے مقصد اپنے مفاد کا حصول اور ہوس پرستی ہے۔ دین ان کے نزدیک معاش کا ذریعہ ہے۔ ان کا منبر روٹی بیچنے والے (نانبائی) کی میز ہے۔ اور بس۔

زیں کلیماں نیست امیدِ کشود
آستیں ہا بے یدِ بیضا چہ سود؟

ان کے ہاتھوں کامیابی کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ جن آستینوں میں نورِ حق موجود نہ ہو، ان سے کس طرح فائدے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

کارِ اقوام و ملل نا اید درست　　　از عمل بنما کہ حق در دستِ تست

قوموں کی اصلاح "ان" "مدعیانِ دین" سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ تم باتیں کرنا چھوڑو اور قرآن کا معاشی نظام قائم کر کے اس کے درخشندہ اور زندگی بخش نتائج سے دنیا کو دکھا دو کہ حق و صداقت تمہارے پاس ہے۔

باب نمبر ۱۰

اشکے چند بر افتراقِ ہندیاں

علّامہ اقبالؒ نے یہ مثنوی اس زمانہ (۱۹۳۶ء) میں لکھی تھی جب ہندوستان پر انگریزی استعماریت کا غلبہ تھا اور اگرچہ ہندوستان کے باشندے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن ان کے باہمی اختلافات ان کی اجتماعی قوّت کو بڑا نقصان پہنچا رہے تھے۔ آزادی کے ایک سچے علمبردار کی حیثیت سے علّامہ کا دل، اپنے ملک کے باشندوں کے اس افتراق و انتشار پر خون کے آنسو روتا تھا۔ وہ ۱۹۳۰ء میں اس مسئلہ کا حل، ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکتوں کی شکل میں پیش کر چکے تھے۔ لیکن ایک طرف ہندوؤں کی تنگ نظری اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ دوسری طرف خود مسلمانوں میں سے ایک عنصر (نیشنلسٹ مسلمان، بالخصوص طبقۂ علماء) اس اسکیم کی شدّت سے مخالفت کر رہا تھا۔ ان کی ان باہمی آویزشوں کا نتیجہ تھا کہ انگریز کی غلامی کے جال کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ یہ تھی وہ صورتِ حالات، جس کے پیشِ نظر انہوں نے بصد تاسف کہا کہ

اے ہمالہ! اے اٹک! اے رودِ گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ؟

اے ہندوستان کے رہنے والو! تم اس قسم کی زندگی پر — جو حقیقی زندگی کے آب و رنگ سے یکسر محروم ہے کب تک قانع رہو گے؟

پیرِ مرداں از فراست بے نصیب
نوجواناں از محبّت بے نصیب

یہاں حالت یہ ہو چکی ہے کہ قوم کے بڑے بوڑھوں میں وہ فراست و بصیرت نہیں رہی جن سے قوموں کے مسائل حل ہوا کرتے ہیں۔ اور اس کے نوجوان طبقہ کے دل آزادی کی محبت کے جذبات سے خالی ہیں ورنہ ان کے جوششِ کردار سے توقع کی جا سکتی تھی کہ غلامی کے ان بندھنوں کو توڑ ڈالیں گے کس قدر تاسف انگیز ہے یہ حقیقت کہ

شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر
خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

مشرق و مغرب کے ممالک آزاد ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ہم غیروں کی غلامی میں زندگی کے دن بسر کرتے ہیں۔ ہمارا ملی سرمایہ، سب دوسروں کی عمارات کی تعمیر میں صرف ہو رہا ہے۔ اپنا کچھ نہیں بنتا۔

زندگانی بر مرادِ دیگراں
جاوداں مرگ است نے خوابِ گراں

دوسروں کی منشا کے مطابق زندگی بسر کرنا، زندگی نہیں موت ہے۔ اگر یہ موت نہ ہوتی، صرف نیند ہوتی تو بھی توقع کی جا سکتی تھی کہ تم کسی دن جاگ اٹھو گے۔ لیکن موت ہے۔ اور وہ بھی مرگِ جاوداں کے بعد حیاتِ نو حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔

نیست ایں مرگے کہ آید ز آسماں
تخمِ اُو می بالد از اعماقِ جاں

یہ موت ایسی نہیں جو تم پر کہیں باہر سے وارد ہوئی ہو۔ اس کا بیج خود تمہارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ اگر یہ مصیبت خارج سے وارد شدہ ہوتی تو اس کا علاج بھی خارج سے ہو سکتا۔ لیکن یہ تو تمہارے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی سے وارد ہوئی ہے۔ لہٰذا جب تک تم اپنے اندر تبدیلی پیدا نہیں کرو گے اس سے نجات حاصل نہیں ہو سکے گی۔ قوموں کی موت و حیات کا یہی وہ اصولِ محکم ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ — (۱۳/۱۱) خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا۔ جب تک وہ قوم خود اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرے۔

غلامی سے قوموں پر طبعی موت نہیں آتی۔ غلام قوم کے افراد، حاکم قوم کے افراد کی طرح جیتے جاگتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا طبعی طور پر وہ زندہ ہوتے ہیں لیکن موت، ان کے احساسات

اور نظریات پر طاری ہوتی ہے۔ ان کے قلب و دماغ مردہ ہوتے ہیں۔ اس لئے

صیدِ اُو نے مُردہ شو خواہد، نہ گور
نَے ہجومِ دوستاں از نزد و دُور
جامۂ کس درغمِ اُو چاک نیست
دوزخِ اُو آں سوئے افلاک نیست

جو اس موت کے ہاتھوں مرتا ہے، اسے نہ غسل دینے والے کی ضرورت ہوتی ہے نہ گورکن کی حاجت۔ نہ اس کے جنازہ پر اس کے دوستوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ نہ کوئی اس کے غم میں ماتم گسار اور سینہ چاک۔ یہ قوم مُردہ ہوتی ہے اور جہنم کے عذاب میں گرفتار۔ لیکن اس کا جہنم وہ نہیں ہوتا جس میں لوگ مرنے کے بعد حیاتِ اُخروی میں ڈالے جائیں گے۔ وہ جہنم اس دُنیا میں ہوتا ہے۔

در ہجومِ روزِ حشر اُو را مجو
ہست در امروزِ اُو فردائے اُو

اس قوم کو "حساب کتاب" کے لئے میدانِ حشر میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ کسی پر "کل" کو بیتنی ہے وہ اس پر "آج" ہی بیت رہی ہوتی ہے۔ اس کے اعمال کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے اور انہی نتائج کا نام غلامی اور محکومی کا وہ درد انگیز عذاب ہے جس میں یہ قوم مبتلا ہوتی ہے۔

ہر کہ ایں جا دانہ کشت، ایں جا درود
پیشِ حق آں بندہ را بُردن چہ سود

جس قوم کے اعمال کے نتائج اس دنیا میں سامنے آرہے ہوں اسے قیامت کے دن کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی قیامت تو ہر وقت اس کے سامنے موجود ہوتی ہے۔

اُمتے کز آرزو نیشے نہ خورد
نقشِ اُو را فطرت از گیتی سترد

جس قوم کے دل میں زندگی کی آرزو اور آزادی کی حرارت باقی نہیں رہتی، فطرت کا اٹل قانون، اس قوم کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔ قومیں تخلیقِ مقاصد سے زندہ اور حصولِ آرزو سے پائندہ ہوتی ہیں۔ جو قوم کسی کی غلام ہو جائے اور پھر اس غلامی کی زندگی پر رضامند، وہ زندگی کی مستحق ہی نہیں رہتی۔ حکمران قوم

محکوم قوم کے دل و دماغ پر ایسا جادُو کر دیتی ہے کہ اسے کوئی شے اس کے اصلی رنگ میں نظر ہی نہیں آتی.

اعتبارِ تخت و تاج از ساحری است
سخت چوں سنگ ایں زجاج از ساحری است

ملوکیت اور استعماریت کی حقیقت "تارِ عنکبوت" سے زیادہ کچھ نہیں. لیکن حکمران قوم کی جادوگری کا اثر ہے کہ محکوم قوم، اس سے ڈرتی اور کانپتی رہتی ہے. اس کی قوّت، کانچ سے زیادہ نہیں ہوتی. لیکن محکوم قوم کی نگاہوں میں وہ سخت پتھر بن کر دکھائی دیتی ہے. چنانچہ انگریز قوم کی اس نگاہ بندی کا نتیجہ ہے کہ

در گذشت از حکم ایں سحرِ مبیں
کافری از کفر و دینداری ز دیں

نہ ہندو اپنے مسلک پر قائم رہا ہے نہ مسلمان. دونوں نے حاکم قوم کے تصورات و نظریات اختیار کر لئے ہیں اور اب انہیں ہر شے انہی کی عینک سے دکھائی دیتی ہے.

ہندیاں بایک دِگر آویختند
فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند

اس سحرِ سامری کا اثر ہے کہ ہندو اور مسلمان، بجائے اس کے کہ دونوں متحد ہو کر انگریز کے خلاف کھڑے ہوں ایک دوسرے کی سر پھٹول میں مصروف ہیں اور اس کے لئے تاریخی افسانوں کو اچھال اچھال کر سامنے لا رہے ہیں تاکہ ان کے اختلاف کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے.

تا فرنگی قومے از مغرب زمیں
ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں

یہ دونوں آپس میں جھگڑتے ہیں اور سرزمینِ مغرب کا فرنگی ان کے کفر اور دین کی نزاع کا فیصلہ کرنے کے لئے "حکایت کے بندر" کی طرح ثالث بن کر آ کھڑا ہوتا ہے.

کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب! اے انقلاب! اے انقلاب!

اس سامری کا اثر ہے کہ اہلِ ہند غلامی اور آزادی میں فرق کرنے کے قابل نہیں رہے. یہ غلامی کی چند مراعات کو آزادی سمجھ رہے ہیں ــــ وائے نادانی قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو ــــ اس فریب سے نکلنے کا علاج اس

کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں انقلاب برپا کیا جائے۔

لیکن اس انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ پہلے قوم کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ ان کی نگاہوں کے زاویئے بدلے جائیں۔ ان کی اقدار بدلی جائیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اسے بتایا جائے کہ حیوان اور انسان کی زندگی میں فرق کیا ہے۔ اس سلسلہ میں علامہؒ فرماتے ہیں۔

اے ترا ہر لحظہ فکرِ آب و گل
از حضورِ حق طلب یک زندہ دِل

حیوان کی زندگی صرف طبعی زندگی ہے۔ اس کے تقاضے صرف جسم کی پرورش کے تقاضے ہیں۔ لیکن انسان کو جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی عطا ہوئی ہے اور وہ ہے اس کی ذات یا نفس۔ اسے "دِلِ زندہ" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا قلب و نظر میں انقلاب کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی نگاہ جسمانی تقاضوں پر ہی نہ رہے۔ انسانی ذات کی نشوونما بھی اس کے سامنے ہو۔

آشیانش گرچہ در آب و گل است
نُہ فلک سرگشتۂ این یک دل است

یہ جسمِ خاکی تو اس طائرِ نہالِ سدرہ (انسانی ذات) کا محض آشیانہ ہے۔ اس کی پرواز کی حدیں اقطار السّمٰوات و الارض سے بھی آگے ہیں۔ یہ تمام سلسلۂ کائنات اس کی آماجگاہ اور اس کے عشق میں سرگرداں ہے۔

تا نہ پنداری کہ از خاک است اُو
از بلندی ہائے افلاک است اُو

یہ خیال نہ کر لینا کہ انسانی ذات بھی مادّہ ہی کی پیداوار ہے۔ نہیں! یہ روحِ خداوندی ہے۔ اس کا سرچشمہ مادّی کائنات سے ماوراء ہے۔

ایں جہاں اُو را حریمِ کوئے دوست
از قبائے لالہ گیرد بوئے دوست

یہ مادّی کائنات اس کے لئے محبوب کی گلیاں ہیں۔ اس کی تسخیر سے یہ اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کرتا ہے۔ یہ دنیاوی زیب و زینت میں بھی اپنے محبوب کے پیرہن کی خوشبو پاتا ہے۔

ہر نفس با روزگار اندر ستیز
سنگِ راہ از ضربتِ اُو ریز ریز

مادّی کائنات کے ساتھ اس کی ہر وقت کشمکش جاری رہتی ہے کیونکہ یہ اپنی پختگی اس کی تسخیر سے کرتی ہے۔ اس کے راستے میں جو مادّی موانعات آتے ہیں یہ انہیں اپنی ضربِ کاری سے ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ نہر کی "ٹھوکر" اس کے راستے میں سنگِ راہ نہیں ہوتی۔ اس کی روانی میں تیزی پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے۔

آشنائے منبر و دار است اُو
آتشِ خود را نگہدار است اُو

یہ علم وعشق دونوں کے مقامات سے واقف ہے۔ یہ اپنی خودی کی حفاظت خود کرتی ہے۔

آبجوئے و بحرہا دارد ببر
می دہد موجش ز طوفانے خبر

یہ یوں تو ایک چھوٹی سی ندی ہے۔ لیکن اس کی وسعتیں اس قدر بے پایاں ہیں کہ اس کی آغوش میں بڑے بڑے سمندر چھپے ہوتے ہیں۔ اس کی ایک ہلکی سی موج، طوفانِ عظیم کی خبر دیتی ہے۔

زندہ و پایندہ بے نانِ تنور
میرد آں ساعت کہ گردد بے حضور

اس کی زندگی کا دارومدار کھانے پینے پر نہیں۔ یہ تو اپنے اندر صفاتِ خداوندی بیدار کرنے سے زندہ رہتی ہے۔ اگر اس میں ان کا انعکاس نہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ یہ زندہ نہیں، مردہ ہے۔

چوں چراغ اندر شبستانِ بدن
روشن از وے خلوت وہم انجمن

مادّی کائنات کی تاریکیوں میں روشنی اسی کے دم سے ہے۔ انسانی زندگی کا ظاہر ہو یا باطن اس کی تابناکی اس کی رہینِ منّت ہے۔

ایں چنیں دل خود نگر، اللہ مست
جز بہ درویشی نمی آید بدست

اس قسم کی زندہ و پائندہ، روشن و تابناک متاعِ گراں بہا، جو اپنی حفاظت آپ کرتی ہے اور جو صفاتِ

خداوندی کی کیف باریوں سے سرمست ہوتی ہے۔ اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان جسم کے مادی تقاضوں کا غلام بن کر نہ رہ جائے۔ بلکہ ان تقاضوں کو اپنی ذات کے تقاضوں کے تابع رکھے۔ اسی کا نام "درویشی" ہے۔

اے جواں دامانِ اُو محکم بگیر
در غلامی زادۂ، آزاد میر

اے قوم کے نوجوانو! تم اپنی ذات کا دامن مضبوطی سے تھامو۔ اس کی نشوونما کی فکر کرو۔ جب تمہاری نگاہوں میں اس کی قدر و قیمت واضح ہو جائے گی تو پھر تم غلامی کی زندگی پر قانع نہیں رہ سکو گے۔ تمہارے قلب و نگاہ میں وہ انقلاب پیدا ہوگا جس سے تمہاری غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں گی اور تم محکومی کے چنگل سے نکل کر آزادی کی فضائے بسیط میں بال کشا ہو جاؤ گے۔

محکومی سے نجات حاصل کرنے کی یہ صحیح تدبیر ہے۔

باب نمبر ۱۱

سیاساتِ حاضرہ

سابقہ باب میں حضرت علامہؒ نے (تقسیم سے قبل) اہلِ ہند سے بالعموم اور مسلمانوں سے بالخصوص کہا تھا کہ ان کے باہمی تشتت و افتراق نے ان کی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط سے مضبوط تر بنا رکھا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ غیروں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے صحیح آزادی کی زندگی بسر کریں اور صحیح آزادی ضبطِ خویش کے بغیر نہیں آسکتی۔

زیرِ نظر باب میں وہ بتاتے ہیں کہ عصرِ حاضر کی (مغربی) سیاست کیا ہے اور انسانیت کے حق میں اس کے اثرات و نتائج کیا؟ سیاستِ حاضرہ کیا ہے؟ جو کچھ انسان اپنے عہدِ جہالت میں کھلے بندوں کرتا تھا اسے تہذیب و تمدن کے نگاہ فریب نقاب میں کرنا۔ بالادست انسانوں کا' زیردستوں کو اپنی محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا۔ لیکن اس انداز سے کہ وہ "قفس کو آشیاں" سمجھنے لگیں۔ اس سیاست کی کیفیت یہ ہے کہ

می کند بندِ غلاماں سخت تر
حریّت می خواند اُو را بے بصر

یہ، محکومی قوموں کی غلامی کی زنجیروں کو سخت سے سخت تر کرتی رہتی ہے۔ صحیح آزادی کے معیار کے مطابق' یہ سیاست یکسر اندھی اور بے بصر ہے۔ لیکن فریب دہی میں اسے کمال حاصل ہے چنانچہ

گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید
پردہ بر رُوئے ملوکیّت کشید

جب اس نے دیکھا کہ عوام میں سیاسی شعور بیدار ہو رہا ہے تو اس نے ملوکیت کے چہرے پر جمہوریت (DEMOCRACY) کا نقاب اوڑھا کر عوام کو خوش کر دیا کہ اب بادشاہوں کے استبداد کا زمانہ ختم ہو گیا. اب عوام کی اپنی حکومت کا دَور آ گیا ہے. حالانکہ

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

ملوکیت میں عوام پر ایک فرد حکومت کرتا تھا۔ جمہوریت میں ایک پارٹی حکومت کرتی ہے. حقیقت یہ ہے کہ سوال حکومت کی شکل (FORM OF GOVERNMENT) کا نہیں. سوال، انسانوں کا انسانوں پر حکومت کرنے کا ہے. اگر ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے تو حکومت کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو، انسانوں کو حقیقی آزادی حاصل ہو نہیں سکتی. یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق حاصل نہ ہو. حکومت کا کام صرف اس قدر ہو کہ وہ ان مستقل اقدار کو نافذ کرے جنہیں خدا نے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے متعین کیا ہے. اور یہ صورت صرف اس ہیئتِ اجتماعیہ کی رُو سے پیدا ہو سکتی ہے جسے قرآن کریم نے تجویز کیا ہے. اسی کا نام "دین و سیاست" کا امتزاج ہے. اگر یہ امتزاج نہ ہو تو استبداد اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے، صرف اس کے پیکر بدلتے رہتے ہیں.

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس کے بعد سیاستِ حاضرہ کی سب سے بڑی لعنت نیشنلزم ہے. قرآن کریم نے بتایا تھا کہ انسانوں کی تقسیم آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ہونی چاہیئے. یعنی دنیا کے جس قدر انسان ایک نصب العین حیات رکھیں وہ ایک قوم کے فرد اور جن کا نصب العین ان سے مختلف ہو وہ دوسری قوم کے افراد. لیکن نیشنلزم نے کہا نہیں! یہ تقسیم غلط ہے. ایک سلطنت کے اندر بسنے والے تمام انسان — خواہ وہ فکر و نظر کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، سب ایک قوم کے افراد ہوں گے. اور انہی اقوام کے نمائندگان پر مشتمل ایک جمعیت الاقوام (U.N.O) ہوگی. اس سے اس سیاست نے اپنے پیشِ نظر مقصد — یعنی کمزوروں اور ضعیفوں پر تغلّب و تسلّط کو تو حاصل کر لیا لیکن اصول ایسا غلط وضع کیا جس سے انسانیت تباہ ہو گئی.

در فضایش بال و پر نتواں کشود
با کلیدش ہیچ در نتواں کشود

ایسی سیاست جس کا مطمحِ نگاہ ہی کمزوروں کا گلا گھونٹنا ہو، کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ اس کی فضا میں کسی کو آزادی کا سانس لینا نصیب ہو سکے۔ یہ ناممکن ہے نہ ہی اس سے انسانی مشکلات کا کوئی حل مل سکتا ہے۔ اس کنجی سے دنیا کا کوئی تالا بھی نہیں کھل سکتا۔

گفت با مرغِ قفس "اے دردمند
آشیاں در خانۂ صیاد بند
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مَرغ
اُو نباشد ایمن از شاہین و چرغ"

یہ سیاست، ہمیشہ مرغِ قفس کو یہ سبق پڑھاتی رہتی ہے کہ

نَے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے "تجھے" آرام بہت ہے

وہ محکوموں کے کان میں یہ افسون پھونکتی رہتی ہے کہ غلامی کی زندگی آزادی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ تم آزاد ہو جاؤ گے تو اپنی مصیبتوں کا حل خود دریافت کرنا پڑے گا۔ کبھی داخلی پریشانیاں اور کبھی خارجی خطرات — یہ دردِ سر مول کیوں لیتے ہو۔ غلامی کی زندگی میں یہ تمام مصیبتیں دوسروں کے سر پر ہوتی ہیں اور محکوم نہایت اطمینان کی نیند سوتا ہے۔

از فسونش مرغِ زیرک دانہ مست
نالہ ہا اندر گلوئے خود شکست

اس سحرکارانہ تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزار عقل و خرد کا مالک محکوم قفس کے آب و دانہ پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور غلامی کے خلاف اس کے احساسات مردہ ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر ایک حرفِ شکایت بھی زبان تک نہیں لاتا۔

حرّیت خواہی بہ پیچاکش میفت
تشنہ میرد بر نمِ تاکش میفت

لہٰذا اگر تم آزادی چاہتے ہو تو اس ابلیسانہ سیاست کے پھندے میں نہ پھنس جانا۔ تم پیاسے مرجاؤ۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم اس کے دانۂ انگور سے اپنے حلقِ خشک کو ترکرو۔

الحذر از گرمیٔ گفتارِ اُو
الحذر از حرفِ پہلو دارِ اُو

ان سیاستدانوں کی باتیں بڑی ملمع کار اور پُر فریب ہوتی ہیں۔ ان میں صداقت اور خلوص نام کو نہیں ہوتا' منافقت اور فریب دہی کا نام ان کے ہاں ڈپلومیسی رکھا جاتا ہے۔

چشم ہا از سُرمہ اش بے نور تر
بندۂ مجبور ازو مجبور تر

اس سیاست کے سرمہ نے دنیا کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ اس سے محکوم اور کمزور اور زیادہ محکوم اور کمزور ہوتے چلے جارہے ہیں۔ حضرت علامہؒ نے بالِ جبریل میں کہا ہے۔

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

یہاں انہوں نے اس آنکھ کو بے بصر و بے نور کہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سیاست کے چشمہ سے دیکھئے تو کوئی شے اپنی اصلی شکل اور رنگ میں دکھائی ہی نہیں دیتی۔ اس سیاست کے اصول (یا بے اصولاپن) نگاہوں کا زاویہ بدل دیتے ہیں۔

از شرابِ ساتگینش الحذر
از قمارِ بد نشینش الحذر

اس سے جس قدر دُور رہا جائے اچھا ہے۔

از خودی غافل نہ گردد مردِ حُر
حفظِ خود کن حبِّ افیونش مخور

مردِ آزاد کو ہمیشہ اپنی ذات کی نگہداشت کرنی چاہیئے۔ اور وہ اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اس سیاستِ پُرفتن کی افیون سے پرہیز کیا جائے۔

پیشِ فرعوناں بگو حرفِ کلیم
تاکند ضربِ تو دریا را دونیم

سیاستِ حاضرہ انسان کو منافق بنادیتی اور اسے مداہنت پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ لیکن حفظِ ذات انسان کے دل میں جرأت اور مردانگی کے جوہر بیدار کردیتی ہے۔ یہی وہ جوہر ہیں جن کی رُو سے ایک مردِ مومن فرعون جیسے استبداد اور قہرمانی کے مجسّمے کے سامنے بیباکانہ حق کی آواز بلند کرتا ہے۔ اور اس جرأتِ ایمانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ضرب سے دریا کا سینہ بھی شق ہوجاتا ہے یعنی اس کے سامنے بڑی سے بڑی مشکل بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

اس کے بعد علامہ مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں اور جیسا کہ ان کا انداز تھا، اپنے سینے کے داغوں کو باصد آہ و فغانِ نیم شبی، نمایاں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

داغم از رسوائی ایں کارواں
در امیرِ اُو نہ دیدم نورِ جاں

کاروانِ ملّت کی زبوں حالی اور خواری کو دیکھ کر میرا سینہ داغ داغ ہوجاتا ہے۔ ان کے لیڈروں میں مجھے وہ نُور دکھائی نہیں دیتا جس سے انسان کی زندگی جگمگا اٹھتی ہے[1]۔

تن پرست و جاہ پرست و کم نگہ
اندرونش بے نصیب از لاالٰہ

یہ ہر وقت اپنے مفاد کی سوچتے ہیں۔ انگریزوں کے ہاں سے جاہ و منصب حاصل کرنا ان کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔ اس قدر تنگ نظر واقع ہوئے ہیں کہ قوم کے مستقبل کے متعلق کبھی نہیں سوچتے۔ بظاہر یہ قوم کے بڑے خیر خواہ اور سچے مسلمان بنتے ہیں لیکن ان کے دل میں ایمان کی رتّی نہیں۔

درحرم زاد و کلیسا را مرید!
پردۂ ناموسِ ما را بردرید

---

[1] یہ تھے وہ حالات جن کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح کو دعوت دی تھی کہ آکر قوم کی کشتی کو سنبھالئے اور انہوں نے اقبالؒ کے اعتماد کو سچ کر دکھایا۔

مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں اور انگریزوں کے مرید ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ملّتِ اسلامیہ کی عزّت و آبرو کو خاک میں ملا دیا ہے۔

دامن اُو را گرفتن ابلہی است
سینۂ اُو از دلِ روشن تہی است

ایسے لیڈروں کے پیچھے چلنا حماقت ہے۔ ان کے سینے میں دلِ زندہ موجود ہی نہیں۔

اندریں رہ تکیہ بر خود کن کہ مرد
صیدِ آہو باسگِ کورے نکرد

اندریں حالات تمہیں چاہیئے کہ ان لیڈروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے آپ پر بھروسہ کرو۔ کبھی اندھے کتّوں کے ساتھ ہرنوں کا شکار بھی ہو سکتا ہے؟ (یہ پنجابی زبان کے ایک محاورہ کا ترجمہ ہے)۔

آہ از قومے کہ چشم از خویش بست
دل بہ غیر اللہ داد، از خود گسست

کس قدر قابلِ تاسّف ہے حالت اس قوم کی جس نے خود اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ اپنی امیدوں کا دامن غیر اللہ کے ساتھ باندھ لیا اور یوں اپنے آپ کو کھو دیا۔

تا خودی در سینۂ ملّت بمرد
کوہ کاہی کرد و باد او را ببرد

جب قوم کے سینے میں خودی کا احساس ختم ہو گیا تو اس کی کیفیت ایک پرِکاہ جیسی ہو گئی جسے ہوا کا ہر تیز جھونکا جدھر جی چاہے اڑائے اڑائے پھرے۔ اس کا اپنا مقام ہی کوئی نہ رہا۔

گرچہ دارد لَا اِلٰہ اندر نہاد
از بطونِ اُو مسلمانے نزاد

مسلمان اس کا اعتراف اور اعلان کرتے ہیں کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر ان کا ایمان ہے۔ یعنی اس حقیقت پر ایمان کہ انسان، قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس قدر بلند نظریۂ زندگی رکھنے والی امّت کے اندر سے ایک بھی مسلمان ایسا پیدا نہیں ہوا جو اس نظریہ کی صداقت کو عملاً دنیا کے سامنے پیش کرتا۔

آنکہ بخشد بے یقیناں را یقیں
آنکہ لرزد از سجودِ اُو زمیں
آنکہ زیرِ تیغ گوید لَآ اِلٰہ
آنکہ از خونش بروید لَآ اِلٰہ
آں سرور آں سوزِ مشتاقی نماند
در حرم صاحب دلے باقی نماند

ایسا مسلمان کہ جس کے ایمان کی قوّت بے یقینوں کے دلوں میں یقینِ محکم پیدا کر دیتی۔ جس کے سجدے سے زمین لرز اٹھتی۔ جو تلوار کے نیچے سر رکھ کر بھی لَا اِلٰہ کہے۔ جس کے خون سے لَا اِلٰہ کا شجرِ طیّب پیدا ہو۔ افسوس کہ امت میں ایسا کوئی مسلمان پیدا نہ ہوا۔ ان میں وہ سرور و سوز جس سے کائنات میں زندگی کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے، باقی نہ رہا۔ حرمِ کعبہ میں ایک بھی ایسا مسلمان نہ رہا جو سینے میں دھڑکنے والا دل رکھتا ہو۔

اے مسلماں! اندریں دیرِ کہن
تا کجا باشی بہ بندِ اہرمن

مسلمان اور اس کے گلے میں ابلیس کا پھندا! بالآخر اس انداز کی زندگی کب تک بسر کرو گے!!

جہدِ با توفیق و لذّت در طلب
کس نیابد بے نیازِ نیم شب

لیکن اس قسم کی زندگی کے لئے جس میں جہادِ مسلسل اور سعیٔ پیہم معمولِ حیات ہو جائے اور اس طلب و کاوش میں انتہائی لذّت محسوس ہو، اس صورت میں میسّر آسکتی ہے کہ انسان راتوں کی تنہائیوں میں انتہائی غور و فکر سے کام لے اور دل کے پورے گداز کے ساتھ احکامِ قرآنی پر عمل کرنے کا تہیّہ کرے۔

زیستن تا کے بہ بحر اندر چو خس
سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس

سمندر میں ایک تنکے کی طرح زندگی بسر کرنا کہ ہر موج اسے اپنے ساتھ بہا کر لے جائے، قابلِ فخر زندگی نہیں۔ انسان کو ضبطِ خویش سے پہاڑ کی طرح محکم ہونا چاہیئے کہ بڑے سے بڑا طوفان بھی اسے اس کے مقام سے نہ ہلا سکے۔

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زئی
مزی چوں خس کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

اس کے بعد حضرت علامہؒ اپنے قلبِ پُرسوز کی ایک ایسی کیفیت کو بیان کرتے ہیں جس سے انسان کی رُوح پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے۔ اس کیفیت کو انہوں نے اگرچہ ایسے انداز میں بیان کیا ہے گویا وہ ان کی ذاتی واردات ہے۔ لیکن یہ درحقیقت پوری کی پوری امت کی قلبی کیفیت کی ترجمان ہے۔ کہتے ہیں۔

گرچہ دانا حالِ دل باکس نگفت
از تو دردِ خویش نتوانم نہفت

اگرچہ عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے دل کا ماجرا کسی سے نہ کہے۔ غمِ دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارند۔ لیکن میں تم سے اپنے دل کا غم چھپا نہیں سکتا۔

تا غلامم در غلامی زادہ ام
ز آستانِ کعبہ دُور افتادہ ام

میں انسانوں کا محکوم ہوں۔ غلامی میں پیدا ہوا اور غلامی ہی میں زندگی بسر کر رہا ہوں۔ کعبہ کہ جو ساری دنیا کے لئے آزادی کا مرکز بننے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا اس کے مقصود و مطلوب سے میں بہت دُور ہٹ چکا ہوں۔ ایک محکوم و غلام کو کعبہ سے کیا نسبت؟

چوں بنامِ مصطفےٰ خوانم درود　　از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ "اے محکومِ غیر　　سینۂ تو از بتاں مانندِ دَیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو
از درودِ خود میالا نامِ اُو"

میں جب رسولؐ اللہ سے اپنی نسبت جوڑتا ہوں اور حضورؐ پر درود و سلام بھیجتا ہوں تو شرم کے مارے پانی پانی ہوجاتا ہوں۔ عشقِ رسولؐ مجھ سے کہتا ہے کہ "اے وہ جو تو غلامی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ تیرے دل میں ہزاروں بُت چھپے ہوئے ہیں۔ تجھے حضورؐ پر درود بھیجتے شرم نہیں آتی؟ جب تو سیرتِ مصطفویؐ کا کوئی پَرتَو بھی اپنے اندر نہیں رکھتا تو اس درُود سے حضورؐ کے اسمِ گرامی کو کیوں داغدار کرتا ہے۔" حضورؐ پر درُود بھیجنے کا

حق اُسی کو حاصل ہے جس کی سیرت، اسوۂ حسنہ نبیٔ اکرمؐ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔

از قیامِ بے حضورِ من مپرس
از سجودِ بے سرورِ من مپرس

میں خدا کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا ہوں اور زبان پر "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" کے الفاظ ہوتے ہیں۔ یعنی یہ اعلان کہ "میں تیرے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہیں کرتا۔" اور دل کہیں اور ہوتا ہے۔ میرا سر سجدہ میں ہوتا ہے لیکن یہ سجدہ محض رسمی ہوتا ہے۔ اس میں وہ کیفیت نہیں ہوتی جو ایک سچے عبدِ مومن کے سجدہ میں ہوتی ہے۔

جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس
قسمتِ مردانِ آزاد است و بس

محکوم کا سجدہ محض ایک رسم کی ادائیگی ہوتی ہے۔ جس سجدہ سے خدا کی صفات انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آجاتی ہیں وہ تو صرف آزاد مردوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔

مردے آزادے چو آید در سجود
در طوافش گرم رو چرخِ کبود

جب کوئی مردِ آزاد سجدہ میں جاتا ہے تو آسمان اس مردِ مومن کا طواف کرنے لگ جاتا ہے۔

ما غلاماں از جلالش بے خبر
از جمالِ لازوالش بے خبر

ہم غلام، نہ جلالِ خداوندی سے آگاہ ہو سکتے ہیں نہ اس کے جمال سے۔

از غلامے لذّتِ ایماں مجو
گرچہ باشد حافظِ قرآں، مجو

غلام کے حصے میں ایمان کی لذّت کیسے آسکتی ہے۔ وہ اگر قرآن کا حافظ ہو تو بھی اس کیفیت سے بے نصیب رہتا ہے۔

مومن است و پیشۂ اُو آزری است
دین و عرفانش سراپا کافری است

غلام قوم کے افراد، مومن کہلاتے ہیں لیکن بُت گری اور بُت فروشی ان کا پیشہ ہوتا ہے۔ ان کی شریعت

اور طریقت دونوں کفر کے مظاہر ہوتے ہیں.

واضح رہے کہ علّامہ اقبالؒ (اور قرآن) کے نزدیک غلام اور آزاد میں یہ فرق نہیں کہ اگر کسی قوم پر کوئی غیر قوم حکومت کرتی ہے تو وہ قوم محکوم ہے اور اگر وہ اپنے ملک پر آپ حکمران ہے تو وہ آزاد ہے. قرآن کی رُو سے محکوم اور آزاد میں فرق یہ ہے کہ اگر کوئی قوم قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرتی ہے تو وہ آزاد ہے اور اگر انسانوں کے خودساختہ قوانین کا اتباع کرتی ہے تو محکوم ہے خواہ ان کی حکومت اپنی ہی کیوں نہ ہو. یہی وہ حقیقت ہے جس کے پیشِ نظر حضرت علّامہؒ کہتے ہیں کہ

در بدن داری اگر سوزِ حیات
ہست معراجِ مسلماں در صلوٰت

اگر دل میں ایمان کی حرارت ہے تو یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ صلوٰت مردِ مومن کو اس مقام پر پہنچا سکتی ہے جس تک دوسرے انسانوں کی نگاہ بھی نہیں پہنچ سکتی ــ صلوٰۃ اس نظام کا نام ہے جس میں ہر فردِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے. اسی اتباعِ احکامِ قرآنی سے جماعت مومنین کو وہ سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوسکتی ہیں جو اقوامِ عالم میں کسی اور کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں.

در نداری خونِ گرم اندر بدن
سجدۂ تو نیست جز رسمِ کہن

اور اگر سینہ حرارتِ ایمان سے خالی ہے تو پھر تیرا سجدہ ایک رسم کے سوا کچھ نہیں.

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

آزاد بندوں کی عید میں ملک اور دین کی شان و شوکت جھلکتی نظر آتی ہے اور محکوموں کی عید ــ کمزوروں اور ناتوانوں کے ہجوم سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی.

یہ ہے آزادی کا تصور اور اس کی قدر و قیمت علّامہ اقبالؒ کے نزدیک. جسے تنگ نظر قدامت پرست 'نیشنلسٹ حضرات' "استعماریت انگریز کا ایجنٹ" کہا کرتے تھے. انسان بھی جوشِ انتقام میں کس حد تک پہنچ جاتا ہے.

باب نمبر ۱۲

حرفے چند با اُمّتِ عربیہ

گزشتہ باب میں حضرت علامہؒ نے بتایا تھا کہ دورِ حاضرہ کی ابلیسی سیاست کس قدر انسانیت سوز ہے اور مسلمانوں کو کس طرح اس اہرمنی بساط سے محتاط رہ کر قرآنی سیاست کے دامن میں پناہ لینی چاہیئے۔ زیرِ نظر باب میں وہ بالخصوص عربی ممالک سے مخاطب ہوتے ہیں کیونکہ ان ممالک میں مغربی حکومتوں کے اقتدار واستعمار کے بڑھنے کے ساتھ تہذیبِ افرنگ کی لعنت بھی اپنے پاؤں پھیلاتے چلی جا رہی تھی اور چونکہ یہ ممالک اسلام کے اوّلین گہوارہ اور ان میں بسنے والی اقوام اس کی پہلی مشعل بردار تھیں اس لئے ان کا اس سیاست سے متأثر ہو جانا بڑے دُور رس اثرات کا حامل ہو سکتا تھا۔ وہ پہلے امّتِ عربیہ کو یاد دلاتے ہیں کہ وہ کس طرح اسلام کی سب سے پہلی علمبردار جماعت تھی۔ وہ ان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ

اے در و دشتِ تو باقی تا ابد
نعرۂ لَا قیصر و کسریٰ کہ زد؟

خدا تمہاری بستیوں کو ابدالآباد تک آباد رکھے۔ یہ بتاؤ کہ وہ کون سی قوم تھی جس نے سب سے پہلے دنیا میں یہ نعرہ بلند کیا کہ ملوکیت، نوعِ انسانی کے لئے لعنت ہے۔ اس لئے اس کا وجود باقی نہیں رہنا چاہیئے۔ اور صرف یہ نعرہ ہی بلند نہیں کیا بلکہ ایسا عملاً کر کے دکھا دیا۔ تم ہی نے وہ نعرہ بلند کیا تھا اور تم ہی نے دنیا سے قیصر و کسریٰ کا نام و نشان تک مٹا کر رکھ دیا۔

درجہانِ نزد و دُور و دیر و زود
اوّلیں خوانندۂ قرآں کہ بود؟

وہ کون سی قوم تھی جس نے اس دنیا میں سب سے پہلے قرآن کی دعوت کی تلاوت کی تھی۔

رمزِ اِلاَّ اللہ کرا آموختند؟
ایں چراغ اوّل کجا افروختند؟

وہ کون سی قوم تھی جسے سب سے پہلے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ دنیا میں خدا کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ اطاعت اور محکومی صرف قوانینِ خداوندی کی جائز ہے اور کسی کی جائز نہیں۔ یہ بتاؤ کہ اس ظلمت کدۂ عالم میں توحید کا یہ چراغ سب سے پہلے کس قوم کے ہاں روشن ہوا تھا۔ تمہارے ہی ہاں ایسا ہوا تھا۔

علم و حکمت ریزۂ از خوانِ کیست؟
آیۂ فَاَصْبَحْتُمْ اندر شانِ کیست؟

یہ کہو کہ دنیا نے علم و حکمت کس قوم سے سیکھا تھا اور وہ کون سے افراد تھے جنہیں رنگ، نسل، زبان، وطن وغیرہ کی نسبتوں سے بلند ہو کر صرف ایمان کے اشتراک سے باہمی بھائی بھائی بنا دیا گیا تھا، وہ تمہیں تھے جن کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ (۳/۱۰۲) "تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس میں سخت دشمن تھے۔ خدا نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی اور اس طرح تمہیں باہمی بھائی بھائی بنا دیا۔"

علّامہ اقبالؒ نے ان ابیات میں یوں تو صدرِ اوّل کے عرب (مسلمانوں) کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن غور سے دیکھئے تو ساتھ کے ساتھ عربوں سے یہ بھی کہتے جا رہے ہیں کہ ذرا سوچو کہ تم کیا تھے اور اب کیا ہو چکے ہو۔ تم نے دنیا سے ملوکیت کو ختم کیا اور اب تم دنیا میں، ملوکیت کی لعنت میں سب سے زیادہ شدّت سے گرفتار ہو۔ تم نے دنیا کے سامنے قرآن پیش کیا اور اب قرآن کی تعلیم سے سب سے زیادہ دُور تم ہو۔ تم نے دنیا کو صحیح آزادی کا سبق دیا اور اب تم بدترین غلاموں کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہو۔ تم نے دنیا میں علم و حکمت کے چراغ روشن کئے اور اب دنیا میں سب سے زیادہ جہالت کی تاریکیاں تمہاری ہی سرزمین پر چھا رہی ہیں۔ سوچو کہ یہ تغیّر کیسے آیا؟

اس کے بعد حضرت علّامہؒ کہتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ تمہیں یہ سب نعمتیں کس ذاتِ گرامیؐ کے صدقے

میں ملی تھیں"۔ اور اس کے بعد وہ چند اشعار سامنے آتے ہیں جن کی مثال نعتیہ لٹریچر میں کم ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور نبیٔ اکرمؐ کی حمد و ستائش کے مقامات میں علامہ اقبالؒ وجد و کیف کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں اور اس سے ان کا کلام ان بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے جن کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ فرماتے ہیں کہ یہ سب تغیرات حضور نبیٔ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کے تصدق ہوئے تھے۔

از دمِ سیرابِ آں اُمّی لقب
لالہ رُست از ریگِ صحرائے عرب

یہ اُسی سحابِ کرم کی گہرباریوں کا صدقہ تھا کہ عرب جیسی بے برگ و گیاہ زمین سے لالہ و یاسمن قطار اندر قطار محفل آرائے عالم ہوئے۔

حرّیت پروردۂ آغوشِ اُوست
یعنی امروزِ اُمم از دوشِ اُوست

اس ذاتِ گرامیؐ نے دنیا کو سب سے پہلے صحیح آزادی سے روشناس کرایا۔ آج دنیا میں جس قدر علم و آزادی کا چرچا ہے یہ سب چودہ سو سال پہلے کی روشن کردہ شمعِ حجازی کی کرنیں ہیں۔

اُو دلے در پیکرِ آدم نہاد
اُو نقاب از طلعتِ آدم کشاد

حضورؐ کی بعثت سے پہلے انسان، فقط آب و گل کا ایک جسدِ بے جان تھا۔ اس میں زندگی کی نمود اور قلب کی تپش آپ کی تعلیم سے ہوئی۔ اس سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھا کہ انسان میں فطرت نے کس قدر لامتناہی قوتیں ودیعت کر رکھی ہیں۔ حضورؐ کی آمد سے انسان کا مستقبل بے نقاب ہو کر سامنے آیا اور ہر طرف سے یہ نعرہ بلند ہوا کہ

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
ایں مشتِ غبارے را انجم بہ سجود آمد

نبیٔ اکرمؐ کی حقیقت کشا تعلیم اور عدیم النظیر عمل سے جو انقلاب دنیا میں آیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ

ہر خداوندِ کہن را اُو شکست
ہر کہن شاخ از نمِ اُو غنچہ بست

اس نے باطل کے ایک ایک "خدا" کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور شجرِ انسانیت کی جو شاخیں یکسر خشک ہو چکی تھیں آپؐ کی حیات آور تعلیم سے ان میں پھر سے برگ و بار پیدا ہو گئے۔

گرمیٔ ہنگامۂ بدر و حنین
حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ

آپ کے جذبۂ ایمان و عمل سے دنیا میں حق و باطل کے معرکے گرم ہوئے اور حضورؐ کی تعلیم و تربیت سے ایسی جلیل القدر ہستیاں پیدا ہوئیں جنہوں نے دنیا کی بساطِ کہن کو اُلٹ کر رکھ دیا۔

سطوتِ بانگِ صلوٰت اندر نبرد
قرأتِ الصّٰفّٰت اندر نبرد

حضورؐ نے جہاں مسجد میں بیٹھ کر ایسے ایسے مجاہد تیار کئے وہاں ان مجاہدوں کو یہ بھی سکھایا کہ وہ عین میدانِ جنگ میں کس طرح خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر دنیا کو بتا دیں کہ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ (۶/۱۶۳) ــــ ہماری صلوٰۃ و مناسک، ہمارا مرنا اور جینا سب اس خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کا ضامن ہے۔ میدانِ جنگ میں مجاہدین کی یہ صفیں اس بلند و بالا حقیقت کی گواہی دیں کہ اِنَّ اِلٰهَكُمۡ لَوَاحِدٌ (۳۷/۴) "تمہارا حاکم اور آقا صرف ایک خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔

تیغِ ایوبی نگاہِ بایزید
گنج ہائے ہر دو عالم را کلید

آپؐ کی تعلیم نے دین و سیاست کو اس طرح ایک دوسرے میں سمو دیا کہ اس سے یک طرف صلاح الدین ایوبیؒ جیسے مردِ میدان پیدا ہوئے اور دوسری طرف بایزید بسطامیؒ جیسے مزکّی انسان ــــ دین و سیاست کی یہی وہ وحدت تھی جس نے دنیا و آخرت کی کامیابیوں کے دروازے کھول دئے۔

حضورؐ کی تعلیم سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ فقر و شاہی یک جا ہو گئے۔ بلکہ یہ بھی کہ "فلسفہ و روحانیت" ــــ جنہیں اس سے پہلے ایک دوسرے کی ضد سمجھا جاتا تھا ــــ ایک ہی قالب میں سمو گئے۔

عقل و دل راستی از یک جامِ مے
اختلاطِ ذکر و فکرِ رومؒ و رےؒ

قرآن کی تعلیم کا اثر تھا کہ سوز و سازِ رومیؔ اور پیچ و تابِ رازیؔ ایک جگہ جمع ہوگئے۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (۳/۱۸۹ - ۹۰) "یقیناً زمین و آسمان کی تخلیق اور لیل و نہار کی گردش میں ان اربابِ عقل و بصیرت کے لئے نشانیاں ہیں جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے اللہ کے قوانین کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں اور تخلیق کائنات پر غور و فکر کے بعد پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگاہِ کائنات کو نہ بے مقصد پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریب کے لئے۔"
یہ ہیں وہ اربابِ "ذکر و فکر" جو قرآنی تعلیم سے وجود میں آتے ہیں۔ حضور نبئ اکرمؐ کی تعلیم و تربیت سے ایسی ہی اُمت متشکل ہوئی تھی جس کی حالت یہ تھی کہ

علم و حکمت، شرع و دیں، نظمِ امور
اندرونِ سینہ دل ہا ناصبور

دماغ ایسے کہ وہ جہاں بانی و جہاں کشائی کے لاینحل مسائل کو سلجھا کر رکھ دیں۔ تفقہ کا یہ عالم کہ شرع و دیں کا کوئی گوشہ ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہے اور اس کے ساتھ سینوں میں ایسے مضطرب قلب کہ وہ انسانیت کی غمگساری میں ہمیشہ تڑپتے رہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ذوقِ لطیف اور تحسینِ زیبائی کا یہ عالم کہ

حسنِ عالم سوزِ الحمرا و تاج
آنکہ از قدوسیاں گیرد خراج

انہوں نے الحمرا و تاج جیسے حسین و جمیل شاہکار پیدا کئے جو انسان تو انسان، آسمان کے فرشتوں سے بھی داد لئے بغیر نہیں رہتے۔
یہ تمام علم و حکمت، ذوق و شوق، سعی و عمل۔ یہ تمام "قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال"۔

ایں ہمہ یک لحظہ از اوقاتِ اوست
یک تجلی از تجلیاتِ اوست

یہ سب، اس مجموعۂ حسن و خوبی، اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک پرتو تھا۔ یہ سب اس

لئے تھا کہ اس اُمت نے حضورؐ کی شمعِ زندگی کو اپنے لئے اسوۂ حسنہ بنایا تھا۔

ظاہرش ایں جلوہ ہائے دلفروز
باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

اور یہ سب کچھ حضورؐ کے ان اعمالِ حیات کا نتیجہ تھا جو محسوس طور پر دنیا کے سامنے آئے۔ باقی رہا مقامِ نبوت ــــ سو وہ، عام انسان تو ایک طرف، عارفوں کی نگاہیں بھی اس حد تک نہیں پہنچ سکتیں۔ حضرت علامہؒ نے اس مقام کے متعلق کہا ہے کہ وہ عارفوں کی نگاہوں سے بھی ہنوز پنہاں ہے۔ اس میں ہنوز کا سوال ہی نہیں۔ یہ ہمیشہ پنہاں رہے گا۔ اس لئے کہ نبوت کی کنہ وحقیقت سے غیر از نبی واقف ہو ہی نہیں سکتا۔ اور نبوت حضورؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گئی۔ لہٰذا اب کوئی جان ہی نہ سکے گا کہ نبوت کی کیفیت و ماہیت کیا تھی۔

حمد بے حد مر رسولِؐ پاک را
آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را

خواجہ عطار کا شعر ہے

حمد بے حد مر خدائے پاک را
آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را

علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں تصرف کیا ہے۔ لیکن ہماری بصیرت کے مطابق یہ تصرف، حقیقت سے تجاوز کر گیا ہے۔ اس میں ذرا کلام نہیں کہ انسانوں کو خدا کا آخری کلام نبیِ اکرمؐ کی وساطت سے ملا۔ رسالتِ محمدیہؐ نہ ہوتی تو دنیا "ایمان اور کتاب" سے محروم رہتی۔ لیکن قرآنِ کریم نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ حضورؐ کا فریضہ دنیا تک خدا کا پیغام پہنچانا تھا۔ کسی انسان کو ایمان عطا کرنا، حضورؐ کے اختیار میں نہیں تھا۔ قرآن کا ارشاد اس باب میں واضح ہے جہاں کہا گیا کہ اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ (۲۸/۵۶) "یہ ضروری نہیں کہ جسے تو چاہے اسے صحیح راستے پر لے آئے۔ صحیح راستے پر وہی آ سکتا ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق صحیح راستہ اختیار کرنا چاہے۔" اس آیت کے مطالب کے ضمن میں مولانا شبیر احمد عثمانی (مرحوم) یہ حاشیہ لکھتے ہیں۔

یعنی جس سے تم کو طبعی محبت ہو یا دل چاہتا ہو کہ فلاں کو ہدایت ہو جائے لازم نہیں

کہ ایسا ضرور ہو کر رہے۔ آپ کا کام صرف راستہ بتانا ہے۔ آگے یہ کہ کون راستہ پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے۔ کون نہیں پہنچتا۔ یہ آپ کے قبضۂ اختیار سے خارج ہے۔

اس باب میں حضورؐ کی شدّتِ آرزو کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ٥ (۲۶/۳) تُو تو شاید اس غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ لیکن حضورؐ سے کہہ دیا گیا کہ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹) "کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں؟" لہٰذا جہاں تک انسانوں کے ایمان لانے کا تعلق ہے

(۱) اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا تاکہ لوگ اس کے مطابق ایمان لائیں۔ اور حضورؐ نے اسے لوگوں تک پہنچا دیا۔ اور

(۲) اس بات کو خدا نے انسانوں کی مرضی پر چھوڑ دیا کہ وہ جی چاہے تو اس پر ایمان لے آئیں اور جی چاہے اس سے انکار کر دیں۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ لہٰذا جہاں تک اس راہ نمائی کا تعلق ہے جس پر ایمان لانا ضروری ہے وہ خدا کی عطا کردہ ہے۔ اس اعتبار سے خواجہ عطارؔ نے ٹھیک کہا تھا کہ

حمد بے حد مر خدائے پاک را
آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را

اور جہاں تک ایمان لانے کا تعلق ہے اسے انسان کے اختیار و ارادہ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے نبیِ اکرمؐ سے کہہ دیا کہ یہ ضروری نہیں کہ جس کے متعلق آپ چاہیں وہ بالضرور ایمان لے آئے۔ یہاں تک حضور نبیِ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کا تذکرۂ جلیلہ تھا۔ اب پھر خطاب ملّتِ عربیہ سے ہے۔ ارشاد ہے۔

حق ترا بُرّاں تر از شمشیر کرد
سارباں را راکبِ تقدیر کرد

اللہ تعالیٰ نے تمہیں بڑی اہم خصوصیات سے نوازا تھا۔ تمہاری کاٹ شمشیر سے بھی زیادہ تیز تھی۔ تم شتربان تھے لیکن خدا نے تقدیرِ اُمم تمہارے ہاتھ میں دی تھی۔

بانگِ تکبیر و صلوٰت وحرب وضرب
اندراں غوغا گشادِ شرق وغرب

تمہاری نمازوں کی تکبیر اور میدانِ جنگ میں تمہاری للکار و یلغار نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا. لیکن تمہاری یہ یلغار و پکار، تخریب وفساد اور سلب ونہب کے لئے نہیں تھی. اس میں کاروانِ انسانیت کے لئے کامیابی کی راہیں کشادہ ہونے کا راز پنہاں تھا. تمہاری صف آرائیاں اور نبرد آزمائیاں، انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے تھیں.

اے خوش آں مجذوبی ودل بُردگی
آہ زیں دل گیری و افسردگی

لیکن کہاں تمہاری وہ رعنائی وزیبائی اور آج کہاں یہ اس قدر افسردگی اور درماندگی! کیا تم وہی قوم ہو؟

کارِ خود را اُمتاں بردند پیش
تو ندانی قیمتِ صحرائے خویش

کسی زمانے میں اقوامِ عالم کی امامت تمہارے سپرد تھی. آج حالت یہ ہے کہ دنیا کی قومیں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہیں اور تمہیں خود اپنے ملک کی اہمیت کا اندازہ تک نہیں.

اُمتے بودی اُمم گردیدۂ
بزمِ خود را خود زہم پاشیدۂ

تم مختلف قبائل و شعوب کی افتراق انگیز لعنت میں گرفتار تھے. ایمان کے سر رشتے نے تمہیں ایک امت بنا دیا. لیکن آج تم اُمتِ واحدہ کی بجائے پھر مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہو اور اس طرح تم نے خود اپنے ہاتھوں اپنی محفل کا شیرازہ بکھیر دیا ہے.

ہر کہ از بندِ خودی وارَست، مُرد
ہر کہ با بیگانگاں پیوست، مُرد

یاد رکھو! جس قوم نے اپنی خودی کو کھو دیا وہ تباہ ہو گئی. جو اپنوں سے کٹ کر دوسروں کے ساتھ جا ملا وہ ختم ہو گیا. تم یہی کچھ کر رہے ہو.

آنچہ تو با خویش کردی، کس نکرد
روحِ پاکِ مصطفیؐ آمد بدرد!

جو کچھ تم نے اپنے ساتھ کیا ہے کسی قوم نے ایسا نہیں کیا ہوگا. تمہاری موجودہ حالت کو دیکھ کر نبیٔ اکرمؐ کی روحِ پاک سخت درد آلود ہے.

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ اُو نگر

تمہیں کچھ علم ہی نہیں کہ اہلِ فرنگ تمہیں کس فریب میں مبتلا کر رہے ہیں. انہوں نے تم پر عجیب انداز کا جادو کر رکھا ہے اور تمہیں اس کا احساس تک نہیں. ذرا ہوش میں آؤ اور دیکھو کہ انہوں نے تمہاری تباہی کے لئے کس قدر فتنے اپنی آستین میں چُھپا رکھے ہیں.

از فریبِ اُو اگر خواہی اماں
اشترانش را ز حوضِ خود براں

اگر تم ان کے فتنہ و فریب سے بچنا چاہتے ہو تو انہیں اپنے ملک سے باہر نکال دو. یاد رکھو!

حکمتش ہر قوم را بیچارہ کرد
وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد

اہلِ مغرب کی مکّاریوں اور فسوں سازیوں نے ہر قوم کو کمزور و ناتواں بنا کر رکھ دیا ہے. اسی نہج پر انہوں نے تمہاری وحدت کو بھی پارہ پارہ کر دیا ہے.

تا عرب در حلقۂ دامش فتاد
آسماں یک دم اماں اُو را نداد

یاد رکھو! اہلِ مغرب ہر ممکن تدبیر کریں گے کہ تم ان کی غلامی کے پھندے میں پھنس جاؤ. اگر تم ان کا فریب کھا گئے تو تمہاری زندگی تمہارے لئے مستقل عذاب بن جائے گی. ان کے حلقۂ دامِ فریب سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم پھر سے اپنے اندر صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی سی صفات پیدا کرو.

عصرِ خود را بنگر اے صاحب نظر
در بدن باز آفریں رُوحِ عمرؓ

تم اپنے زمانے کے تقاضوں پر نگاہ رکھو اور اپنے بدن میں پھر سے روحِ عمرؓ بیدار کرو۔

قوّت از جمعیتِ دینِ مبیں
دیں ہمہ عزم است و اخلاص و یقیں

تمہاری قوت کا راز، دین کے ساتھ وابستگی میں ہے ۔ دین کیا ہے؟ نہایت خلوص اور دیانت سے، وحی کے ابدی حقائق پر یقین رکھنا اور عزم راسخ سے ان پر عمل پیرا ہو جانا۔ یہ کرو اور پھر دیکھو کہ تمہارا کھویا ہوا مقام کس طرح پھر سے تمہیں واپس ملتا ہے۔

تا ضمیرش رازدانِ فطرت است
مردِ صحرا پاسبانِ فطرت است
سادہ و طبعش عیارِ زشت و خوب
از طلوعش صد ہزار انجم غروب

مردِ صحرا، نہایت سادہ دل ہوتا ہے۔ اس کی فطرت پاک اور ضمیر صاف ہوتا ہے۔ اس لئے وہ فطرت کا پاسبان ہوتا ہے۔ چونکہ اس کا ضمیر پاک ہوتا ہے اس لئے وہ اچھائی اور برائی کے پرکھنے کا معیار بن جاتا ہے۔ لہٰذا جب اس سورج کی نمود ہوتی ہے تو اس سے باطل کی ملمع کاریوں کے ہزاروں ستارے غروب ہو جاتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ انسان کا قالب جس قدر سادہ اور فریب اور ملمع کاریوں کی خباثتوں سے پاک ہوگا اس میں قبولِ حق کی صلاحیت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ اس کی فطرت خیر اور شر کی میزان بن سکتی ہے۔ خیر و شر کے پرکھنے کی کسوٹی صرف خدا کی وحی ہے۔ البتہ، جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے جو قلب فریب کاریوں کی آلودگی سے پاک ہوگا، وہ حق کی طرف جلد آجائے گا۔

بگذر از دشت و در و کوہ و دمن
خیمہ را اندر وجودِ خویش زن

تو ملک اور وطن کی حد بندیوں سے آگے گزر جا۔ حکمتِ افرنگ نے تمہارے صحرا میں جو مصنوعی لکیریں کھینچ رکھی ہیں انہیں مٹا دے اور اپنی خودی میں ڈوب جا۔ پھر سے قلبِ صدیقؓ اور ایمانِ عمرؓ پیدا کر۔

طبع از بادِ بیاباں کردہ تیز
ناقہ را سردہ بمیدانِ ستیز

اپنی طبیعت میں تیزی اور جولانی پیدا کر اور باطل کے مقابلے کے لئے میدان میں نبرد آزما ہوجا۔

عصرِ حاضر زادۂ ایّامِ تست
مستیٔ اُو از مئے گلفامِ تست
شارحِ اسرارِ اُو تو بودۂ
اوّلیں معمارِ اُو تو بودۂ

اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ زمانہ، علم و حکمت میں بہت ترقّی کر گیا ہے لیکن تیرے لئے اس سے مرعوب ہونے کی کوئی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے نے یہ سب کچھ تمہارے ہی اسلاف سے مستعار لیا ہے۔ وہ عرب کے مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو علم و حکمت سے آشنا کرایا۔

تا بہ فرزندی گرفت او را فرنگ
شاہدے گردید بے ناموس و ننگ
گرچہ شیریں است و نوشیں است اُو
کج خرام و شوخ و بے دین است اُو

یہ تمام علم و حکمت تمہارے پیدا کردہ تھے۔ لیکن جب انہیں یورپ نے اپنی "فرزندی" میں لیا تو اپنے باطل نظریات حیات کی تربیت سے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ یہ شاہدِ رعنا، ننگ و ناموس سے عاری ہوگیا۔ یہ بظاہر نہایت نرم و نازک، حسین و جمیل اور شوخ و شنگ ہے لیکن لادینی کی وجہ سے انسانیت کی تمام صفاتِ حسنہ سے محروم ہوچکا ہے۔

مردِ صحرا! پختہ تر کن خام را
بر عیارِ خود بزن ایّام را

اے مردِ صحرا! تو ایک بار پھر اُٹھ۔ اس علم و حکمت کو اپنے آغوش میں ایک مرتبہ پھر تربیت دے۔ ہر چیز کو دین کے میزان میں تول اور اس طرح ان کی تمام خامیوں کو دُور کر کے انہیں پختگی عطا کردے۔

تو نے ایک دفعہ پہلے بھی ایسا کیا تھا اب پھر اسے دُہرا۔ زمانہ تیرا انتظار کر رہا ہے۔

باب نمبر ۱۳

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

زیرِ تشریح مثنوی کا نام "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" ہے۔ زیرِ نظر باب کا بھی یہی عنوان ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت علامہؒ نے اس باب میں یہ بتایا ہے کہ اقوامِ مشرق کو اپنی حالت سنوارنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ واضح رہے کہ یہ مثنوی ۳۶-۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ پہلے بند میں وہ لکھتے ہیں۔

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ

مغربی سیاست اور تہذیب کے ہاتھوں ساری دنیا بلبلا اٹھی ہے۔ ہر طرف اضطراب اور شورش برپا ہے۔ دنیا میں امن و سکون کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہا۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق
باز روشن می شود ایامِ شرق

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں اقوامِ مشرق کو کیا کرنا چاہیئے جس سے انہیں پھر وہی عروج حاصل ہو جائے جو انہیں پہلے کبھی حاصل تھا۔ اس سے عالمِ انسانیت، اقوامِ مغرب کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کرلیں گی۔

در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گذشت و آفتاب آمد پدید

قرآئن بتا رہے ہیں کہ اقوامِ مشرق کے دل کی گہرائیوں میں انقلاب کروٹیں لے رہا ہے۔ ان کی تاریکی کی راتیں ختم ہونے کو ہیں اور ان کی اقبال مندی کی صبح پھر نمودار ہونے والی ہے۔

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد
زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد

دوسری طرف یورپ کی یہ حالت ہے کہ اس نے اپنی لادین سیاست و معاشرت کا جو خنجر تیار کیا تھا اس کے ہاتھوں وہ خود ہی ذبح ہوگیا ہے۔ مغربی تہذیب کی بنیاد اس نظریئے پر تھی کہ سیاست کو اخلاق کے اصولوں اور مستقل اقدار کی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہیئے۔ زندگی انسان کی طبیعی زندگی ہے۔ اور اس زندگی کی آسائش کے لئے جس طریق سے ساز و سامان حاصل ہوجائے اُسے بلاتوقف اختیار کر لینا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم اخلاقیات سے یوں بے نیاز ہوجائے تو اس کی تباہی خود اپنے ہاتھوں سے آجاتی ہے۔

گرگے اندر پوستینِ برۂ
ہر زماں اندر کمینِ برۂ

اس مکاری پر مبنی سیاست کا نتیجہ یہ تھا کہ یورپ کی اقوام دنیا کی چھوٹی چھوٹی اور کمزور قوموں کو ہڑپ کرنے کے لئے نکل کھڑی ہوئیں لیکن رہزنوں اور قزاقوں کی شکل میں نہیں بلکہ نہایت مشفق اور غمخوار دوستوں کے لباس میں۔

مشکلاتِ حضرتِ انساں ازوست
آدمیت را غمِ پنہاں ازوست

ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ عالمگیر انسانیت طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا ہے اور کسی قلب کو سکون حاصل نہیں۔ ان تمام مشکلات کا سرچشمہ یورپ کا یہ نظریۂ زندگی ہے کہ

در نگاہش آدمی آب و گِل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

زندگی یہی مادّی زندگی ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ اور موت سے اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ جب زندگی کا نظریہ یہ ٹھہرے تو پھر جائز و ناجائز کی کیا تمیز اور خیر و شر سے کیا امتیاز۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔

اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے حضرت علامہؒ لکھتے ہیں کہ

ہرچہ می بینی ز انوارِ حق است
حکمتِ اشیاء ز اسرارِ حق است

یہ کائنات بالمقصد پیدا کی گئی ہے۔ انسان آب و گل ہی کا پیکر نہیں۔ اس میں ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسان اور کائنات مشیّت کے عظیم پروگرام کے مطابق ایک منزل کی طرف رواں دواں بڑھے جارہے ہیں۔

ہر کہ آیاتِ خدا بیند حُر است
اصلِ ایں حکمت ز حکمِ اُنظُر است

کائنات کے ذرّے ذرّے میں ہزار حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ قرآن نے تاکید کی ہے کہ اشیائے کائنات کا پورا پورا علم حاصل کیا جائے۔ اسی علم سے اس کا وہ راستہ روشن ہوجائے گا جو انسان کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں اشیائے کائنات کو آیات اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

بندۂ مومن از و بہروز تر
ہم بہ حالِ دیگراں دل سوز تر

اسی علم الاشیاء سے مومن کو عروج و اقبال حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس علم کو وہ مظلوموں اور کمزوروں کو لوٹنے کھسوٹنے کا ذریعہ نہیں بناتا۔ بلکہ وہ اس سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہے۔

علم چوں روشن کند آب و گلش
از خدا ترسندہ تر گردد دِلش

اس علم سے اس کے دل میں ابلیسانہ سرکشی نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے اور عجز و انکساری سے جُھک جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان قوانین سے سرتابی کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

علمِ اشیاء خاکِ ما را کیمیاست
آہ! در افرنگ تاثیرش جداست

مادّی کائنات کا علم ہماری مادّی زندگی میں انسانیت کے بلند مقام پر لے جاتا ہے۔ لیکن یورپ میں یہی

علم کچھ اور نتائج پیدا کرتا ہے۔

عقل و فکرش بے عیارِ خوب و زشت
چشمِ اُو بے نم، دلِ اُو سنگ و خشت

یہ اس لئے کہ یورپ کے پاس خیر اور شر، حق اور باطل، جائز اور ناجائز کے پرکھنے کے لئے کوئی خارجی اور غیر متبدّل معیار نہیں۔ جائز وہ جس سے اپنے مفاد حاصل ہوتے ہوں۔ خواہ اس سے دوسروں کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ دوسروں کی مصیبت ان کی آنکھ میں نمی پیدا کرتی ہے نہ مظلوموں کا غم ان کے دل میں گداز۔

علم ازو رسواست اندر شہر و دشت
جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت

وہی علم کہ جس کا مقام کائنات میں بہت بلند ہے ان کے اس نظریۂ زندگی کی وجہ سے ذلیل اور رسوا ہو چکا ہے۔ یوں کہیئے کہ ان کی صحبت میں رہ کر جبرئیل، ابلیس بن گیا ہے۔

دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش
در ہلاکِ نوعِ انساں سخت کوش

یہ علم جسے نوعِ انسانی کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہیئے تھا، یورپ نے اسے نوعِ انسانی کی ہلاکت کے لئے صرف میں لانا شروع کر دیا ہے۔

باخساں اندر جہانِ خیر و شر
در نسازد مستیٔ علم و ہنر

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کی سیرت نیک اور کردار بلند نہ ہو تو علم و ہنر میں ترقی اسے کبھی راس نہیں آتی۔ اس سے دنیا بھی مصیبت میں پھنس جاتی ہے اور وہ خود بھی مشکلات میں الجھ جاتا ہے۔

آہ از افرنگ و از آئینِ اُو
آہ از اندیشۂ لا دینِ اُو
علمِ حق را ساحری آموختند
ساحری نے، کافری آموختند

یورپ نے دین کو سیاست سے الگ کر کے دنیا میں چنگیزیت کی طرح ڈال دی۔ وہ علم الاشیاء کے ذریعے کمزور قوموں پر گویا جادو کر دیتے ہیں۔ وہی علم جو انسان کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنا سکھاتا ہے ان کے ہاں ان قوانین سے سرکشی اور بغاوت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

ہر طرف صد فتنہ می آرد نفیر
تیغ را از پنجۂ رہزن بگیر

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فتنہ و فساد چاروں طرف سے ہجوم کر کے آجاتا ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ علم نہیں بلکہ ایک ڈاکو کے ہاتھ میں خنجر ہوتا ہے۔ انسانیت اسی صورت میں امن میں رہ سکتی ہے کہ اس ڈاکو کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا جائے۔

اے کہ جاں را باز می دانی ز تن
سحرِ ایں تہذیبِ لادینے شکن

وہ اقوامِ مشرق سے کہتے ہیں کہ تمہارا نظریۂ زندگی مغرب سے مختلف ہے۔ تم انسانی زندگی کو صرف طبیعی جسم تک محدود نہیں سمجھتے۔ انسانی ذات کو اس کے جسم سے الگ تشخص تسلیم کرتے ہو۔ اسی سے تم میں اور مغربی فکر میں ایک بنیادی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ تم اس پوزیشن میں ہو کہ تہذیبِ مغرب کے اس طلسم کو توڑ ڈالو۔

روحِ شرق اندر تنش باید دمید
تا بگردد قفلِ معنی را کلید

ضرورت اس کی ہے کہ مغرب کے پیکر میں مشرق کی روح پھونک دی جائے تاکہ اس سے رموزِ انسانیت کے وہ تالے کھل جائیں جو اس وقت تک بند پڑے ہیں۔

چونکہ مشرق تمام مذاہب کا سرچشمہ اور گہوارہ رہا ہے اس لئے علامہ اقبالؒ مغرب کے مقابلے میں مشرق کو لاتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ مشرق میں دین کا صحیح تصور قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا اس لئے یورپ کے لادینی پیکر میں قرآن کے ذریعے ہی صحیح زندگی کی روح پھونکی جا سکتی ہے۔

عقل اندر حکمِ دِل یزدانی است
چوں ز دل آزاد شُد شیطانی است

انسانی عقل اگر وحیٔ خداوندی کے تابع رہے تو یہ خدا کی نعمت ہوتی ہے۔ لیکن اگر اسے وحی کے تابع نہ رکھا جائے تو یہ سب سے بڑا ابلیسی حربہ بن جاتی ہے۔

زندگانی ہر زماں در کش مکش
عبرت آموز است احوالِ حبش

۱۹۳۵ء کا ذکر ہے کہ اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی کے سر میں نشۂ قوت نے سودا پیدا کر دیا اور اس نے حبش کی کمزور سلطنت پر خواہ مخواہ یورش کر کے اسے اٹلی کی سلطنت کا ایک حصہ بنا لیا۔ حبش کا بادشاہ اور اس کے باشندے بہتیرا واویلا کرتے رہے لیکن کوئی ان کی فریاد کو نہ پہنچا۔ یورپ کے مختلف ممالک بھی یہ تماشا دیکھتے رہے اور لیگ آف نیشنز (جس کا صدر مقام جنیوا تھا) منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھی رہی۔ علامہ اقبالؒ نے اس واقعہ کو بطور نظیر پیش کر کے مشرق کی کمزور قوموں سے کہا ہے کہ اگر تم نے اپنے اندر قوت پیدا نہ کی تو جو حشر اٹلی کے ہاتھوں حبش کا ہوا ہے وہی انجام تمہارا ہوگا۔ اس لئے کہ

شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل و قال
برّہ را کرد است بر گرگاں حلال

یورپ کے حاملینِ شریعت نے یہ فتوے صادر کر دیا ہے کہ بکری کے بچّے کا خون بھیڑیے کے لئے جائز اور حلال ہے۔

نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد
از کفن دزداں، چہ اُمیدِ کشاد

ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا میں عدل و انصاف کے لئے ایک نئی طرح ڈالی جائے۔ ان کفن چوروں سے بہتری کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ علامہ اقبالؒ نے لیگ آف نیشنز کے متعلق بہت پہلے کہا تھا کہ

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

مثنوی کے مندرجہ بالا شعر میں انہی کفن چوروں کی طرف اشارہ ہے جس کی تشریح اگلے شعر میں ان الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ

در جنیوا چیست غیر از مکر و فن
صیدِ تو این میش و آں نخچیرِ من

لیگ آف نیشنز میں اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ طاقتور قومیں باہمی فیصلہ کر لیتی ہیں کہ فلاں کمزور ملک کو تم ہڑپ کر جاؤ اور فلاں قوم کو میں ہضم کئے لیتا ہوں۔

نکتہ ہا کو می نہ گنجد در سخن
یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

مختصر الفاظ میں یوں سمجھیئے کہ مغرب کی تہذیب، ان کے آئین و قوانین، متحدہ اقوامِ عالم دنیا کی تمام مصیبتوں کا سرچشمہ اور فتنہ و فساد کی جڑ ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو
مومنِ خود، کافرِ افرنگ شو

وہ اقوامِ مشرق سے کہتے ہیں کہ تم نے مغربی تہذیب و تمدن کا جو اثر لے رکھا ہے اسے جھٹک کر الگ کر دو۔ انہیں برملا کہہ دو کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے بیزار ہیں۔ اس کے بعد اپنے نظریہ زندگی کی بنیادوں پر تہذیب کی نئی عمارت استوار کرو (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس میں خطاب اگرچہ اقوامِ شرق سے ہے لیکن مقصود اس سے امتِ مسلمہ ہی ہے)۔ وہ اس اُمت سے کہتے ہیں۔

رشتۂ سود و زیاں در دستِ تُست
آبروئے خاوراں در دستِ تُست

ان اقوام کے نفع و نقصان کا فیصلہ تم نے کرنا ہے۔ مشرق کی عزت اور آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔

ایں کہن اقوام را شیرازہ بند
رایتِ صدق و صفا را کن بلند

ان قدیم اقوام کو جو اس وقت بُری طرح سے منتشر ہو رہی ہیں ایک مرکز کے تابع جمع کرو لیکن ظلم و استبداد کے لئے مکر و فن سے نہیں بلکہ عدل و احسان کے لئے صداقت اور دیانت کے ساتھ۔ لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ تم میں اتنی قوت ہو کہ اپنے اس آئینِ صداقت کو دنیا سے منوا سکو اس لئے کہ

اہلِ حق را زندگی از قوّت است
قوّتِ ہر ملّت از جمعیت است

محض حق کے نظریئے کا مدّعی ہونا کافی نہیں. اس نظریہ کے حاملین اگر دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں، تو اس کے لئے قوّت کی ضرورت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قوّت کا راز قوم کے اتحاد، یک جہتی اور مرکزیت میں پنہاں ہوتا ہے. اس کے بعد حضرت علاّمہؒ ایک ایسا بنیادی اصول بیان کرتے ہیں جس میں زندگی کا راز پنہاں ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ

رائے بے قوّت ہمہ مکر و فسوں
قوّتِ بے رائے جہل است و جنوں

عقل کی بات کتنی اچھی کیوں نہ ہو، اسے منوانے کے لئے قوّت کی ضرورت ہے. اگر اس کے پیچھے قوّت نہیں تو وہ یا تو مکر و فریب کی شکل اختیار کرلے گی یا محض افسانہ بن کر رہ جائے گی. دوسری طرف اگر کسی قوم کے پاس خالی قوّت ہو اور وہ دانش و بینش سے عاری ہو تو وہ وحشت و بربریت کا مجسّمہ بن جائے گی. زندگی اور سلامتی کے لئے قوّت اور عقل کا امتزاج ناگزیر ہے ــــــــ لیکن عقل وہی جو وحی کے تابع چلے.

اس کے بعد حضرت علاّمہؒ نے ایشیا کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے. ہم اسے پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ دنیا کے مختلف مذاہب کا گہوارہ ایشیا ہی رہا ہے. اس لئے علاّمہ اقبالؒ اسے مادّہ پرستی میں ڈوبے ہوئے یورپ کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں. چنانچہ وہ کہتے ہیں.

سوز و ساز و درد و داغ از آسیاست
ہم شراب و ہم ایاغ از آسیاست

یورپ کے میکانکی اندازِ زیست کے مقابلے میں ایشیا بلند انسانی جذبات کی سرزمین ہے. اس نے نہ صرف دنیا کو جذبات دیئے ہیں بلکہ اظہارِ جذبات کے لئے نئے نئے اصول و انداز بھی وضع کئے ہیں.

عشق را ما دِلبری آموختیم
شیوهٔ آدم گری آموختیم

ہم ہی نے عشق کو دل کشی اور جاذبیت کے انداز سکھائے ہیں. بلکہ اُسے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ کس طرح

پست سطح سے بلند ہو کر انسانیت سازی کا فریضہ ادا کر سکتا ہے۔

ہم ہنر، ہم دیں ز خاکِ خاور است
رشکِ گردوں خاکِ پاکِ خاور است

سرزمینِ ایشیا مختلف ادیان ہی کا سرچشمہ نہیں رہی بلکہ علم و ہنر کے سرچشمے بھی یہیں سے پھوٹے ہیں۔ اس سرزمین کی مٹی کا مرتبہ بڑا بلند ہے۔

وا نمودیم آنچہ بود اندر حجاب
آفتاب از ما و ما از آفتاب

ہم نے ان تمام حقائق کو جو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے واشگاف انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اس سرزمین کو آفتاب سے خاص نسبت ہے۔ اسی لئے تو اسے خاور یا خاوراں کہتے ہیں۔ (خاور کے معنی آفتاب ہیں)۔

ہر صدف را گوہر از نیسانِ ماست
شوکتِ ہر بحر از طوفانِ ماست

دنیا میں جہاں کہیں علم و ہنر نظر آئے گا اس کا سرچشمہ ایشیا ہی ہوگا۔ جہاں کہیں زندگی کی نمود اور اس میں حرکت و حرارت نظر آئے گی وہ کسی نہ کسی رنگ میں سرزمینِ ایشیا ہی کی رہینِ منت ہوگی۔

رُوحِ خود در سوزِ بلبل دیدہ ایم
خونِ آدم در رگِ گل دیدہ ایم

ہماری نگاہِ ژرف بین نے محسوسات کے پیکروں کے اندر معنوی وحدت کو پالیا۔ ہمارے ہاں کا فلسفہ مظاہر سے آگے حقیقت تک پہنچ گیا۔ اور اس طرح ہم نے اس راز کو پالیا کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

ہم نے اشیائے کائنات کا علم ہی حاصل نہیں کیا بلکہ

فکرِ ما جویائے اسرارِ وجود
زد نخستیں زخمہ بر تارِ وجود

ہمارا فلسفہ "وجود" کے رموز و اسرار معلوم کرنے کے لئے کوشاں رہا۔ اور اس میں ہم ہی نے پہل کی۔ "وجود" سے

مراد خود ذاتِ باری تعالیٰ بھی ہوسکتی ہے، اور خود انسانی ذات بھی۔

داشتیم اندر میانِ سینہ داغ
بر سرِ راہے نہادیم ایں چراغ

ہم نے فکر کی گہرائیوں میں ڈوب کر ایسے دیئے جلائے کہ ان سے انسانیت کی راہیں روشن ہوگئیں۔

اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں
آں یدِ بیضا بر آر از آستیں

اقوامِ ایشیا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تم دین اور تہذیبِ کہن کی امین ہو لیکن تم نے اس تابناک چراغ کو تہِ آستیں چھپا رکھا ہے۔ اسے دنیا کے سامنے لاؤ۔ تاکہ تمہیں اقوامِ عالم کی امامت حاصل ہوجائے۔

خیز و از کارِ اُمم بکشا گرہ
نشۂ افرنگ را از سر بنہ

اٹھو اور دنیا جن مشکلات میں گھری ہوئی ہے ان کے حل کرنے کا مداوا سوچو۔ اس کے لئے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ انسانوں کے سر میں تہذیبِ مغرب کا جو سودا سما رہا ہے اسے دُور کرو۔

نقشے از جمعیتِ خاور فگن
واستاں خود را ز دستِ اہرمن

اٹھو اور تمام اقوامِ ایشیا کو ایک مرکز پر جمع کرو۔ اور اس طرح اپنے آپ کو یورپ کے ابلیسی پھندے سے آزاد کراؤ۔

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ
تا کجا در قیدِ زُنّارِ فرنگ

تم اہلِ مغرب سے اچھی طرح واقف ہو اور ان کے ہتھکنڈوں سے باخبر۔ اس کے بعد تم کب تک ان کے دامِ فریب میں گرفتار رہو گے۔

زخم از و، نشتر از و، سوزن از و
ما و جوئے خون و امیدِ رفو

یورپ کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ہر کمزور قوم کے سینے میں خنجر گھونپتا ہے لیکن ہماری سادہ لوحی ملاحظہ ہو

کہ ہم اسی سے اپنے زخموں کا اندمال کرتے ہیں۔

خود بدانی بادشاہی قاہری است
قاہری در عصرِ ما سوداگری است

تمہیں معلوم ہے بادشاہت غلبہ و تسلّط ہی کا دوسرا نام ہے اور ہمارے زمانے میں غلبہ و تسلّط تجارت کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ جو قوم اقتصادی طور پر محکوم ہوتی ہے وہ سیاسی طور پر بھی محکوم ہوتی ہے۔

تختۂ دکاں شریکِ تخت و تاج
از تجارت نفع و از شاہی خراج

آج سیاستِ عالم کی یہ کیفیت ہے کہ حکومت کی باگ ڈور بڑے بڑے صنعت کاروں اور کاروباری لوگوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ بادشاہ تو رعایا سے ٹیکس وصول کرتا ہے اور یہ سوداگر کاروباری منافع کی شکل میں اس سے کہیں زیادہ وصول کرتا ہے۔

آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است
بر زبانش خیر و اندر دل شر است

جو قوم حکومت کے ساتھ تجارت بھی کرتی ہے اس کا انداز یہ ہوتا ہے کہ دوکان دار کی طرح زبان میٹھی لیکن دل کھوٹ سے بھرا ہوا۔

گر تو میدانی حسابش را درست
از حریرش نرم تر کرپاسِ تست

اگر تمہیں کہیں یہ پتہ چل جائے کہ وہ اس تجارت کے چکّر میں تمہاری کس قدر دولت اپنے ملک میں سمیٹ کر لے جاتے ہیں تو پھر تمہیں اس کا احساس ہو کہ تمہارے ہاں کا روئی کا بنا ہوا کپڑا ان کے ہاں کے ریشم سے کہیں بہتر ہے۔

بے نیاز از کارگاہِ اُو گذر
در زمستاں پوستینِ اُو مخر

تم ان کے کارخانوں سے بے نیاز ہو جاؤ۔ سردی برداشت کر لو لیکن ان کے ہاں کا بنا ہوا گرم کپڑا مت خریدو۔

کُشتنِ بے حرب وضربِ آئینِ اوست
مرگہا در گردشِ ماشینِ اوست

تجارت وہ حربہ ہے جس سے ایک قطرہ خون بہائے بغیر قوموں کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ یوں سمجھو کہ ان کے کارخانوں کی مشینوں کے پہیوں کے ساتھ موت لپٹی ہوئی ہے۔

بوریائے خود بہ قالینش مدہ
بیذقِ خود را بہ فرزینش مدہ

تم ان کے ہاں کے قالین پر اپنے ہاں کے بوریا کو ترجیح دو۔ بساطِ سیاست پر اپنے ہاں کے چھوٹے سے مہرے کو ان کے بڑے سے بڑے مہرے سے زیادہ وزنی شمار کرو۔

گوہرش تف دار و در لعلش رگ است
مشکِ ایں سوداگر از نافِ سگ است

مغرب کی تجارت جھوٹے نگوں کی میناکاری ہے۔ ان کے ہر مال میں عیب اور ہر سودے میں کھوٹ ہے۔ جسے وہ مشک کہہ کر پیش کرتے ہیں وہ ناقۂ آہو سے حاصل کردہ نہیں ہوتی بلکہ کتّے کی ناف سے تیار کردہ ہوتی ہے۔

رہزنِ چشمِ تو خوابِ مخملش
رہزنِ تو رنگ و آبِ مخملش

ان کے ہاں کی مخمل کا بستر بظاہر بڑا نرم و نازک دکھائی دیتا ہے لیکن چند دنوں کے بعد معلوم ہوگا کہ اس سے تمہاری راتوں کی نیند حرام ہو جائے گی۔ اس لئے کہ وہ سب کچھ لوٹ کر لے جائے گا اور تم سخت پریشان حال رہ جاؤ گے۔

صد گرہ افگندۂ در کارِ خویش
از قماشِ او مکن دستارِ خویش

تم نے اپنے آپ کو ان چیزوں کا محتاج بنا کر اپنے راستے میں ہزاروں کانٹے بو لئے ہیں۔ ان کا بائیکاٹ کر دو۔ ان کی ململ کتنی ہی نرم و نازک کیوں نہ ہو اس سے اپنی دستار مت بناؤ۔

ہوشمندے از خمِ او مے نخورد
ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مُرد

کوئی صاحب ہوش میخانۂ مغرب سے شراب کا جام نہیں لیتا۔ جس نے وہ شراب پی لی وہ شراب خانے کے اندر ہی مر گیا۔

وقتِ سودا خند خند و کم خروش
ما چو طفلانیم و او شکّر فروش

یہ ہوشیار تاجر سودا کرتے وقت بہت ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے اور کبھی غصے میں نہیں آتا۔ یوں سمجھو کہ یہ میٹھی گولیاں بیچنے والا ہے اور ہم سب بچے اس کے خوانچے کے گرد کھڑے ہیں۔

محرم از قلب و نگاہِ مُشتری است
یارب ایں سحر است یا سوداگری است

وہ خریدار کی نگاہوں کو پہچانتا ہے اور اس کے دل میں مچلنے والی آرزوؤں تک سے واقف ہے۔ یہ تجارت نہیں، کھلا ہوا جادو ہے جس سے ہر ایک ان کے فریب میں آجاتا ہے۔

تاجرانِ رنگ و بو بردند سود
ما خریداراں ہمہ کور و کبود

یہ تاجر بیشتر سامانِ آرائش و زیبائش (سرخی پاؤڈر وغیرہ) لاتے ہیں اور ہم عقل کے اندھوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر سب کچھ لوٹ کر لے جاتے ہیں۔

آنچہ از خاکِ تو رست اے مَردِ حُر
آں فروش و آں بپوش و آں بخُور

جو کچھ تمہاری زمین سے پیدا ہوتا ہے تمہیں وہی کھانا اور پہننا چاہیئے۔

آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند
خود گلیم خویش را بافیدہ اند

جن قوموں کی نگاہیں خود شناس واقع ہوئی ہیں وہ اپنے ہاں خود کپڑا بُن کر استعمال کرتی ہیں۔

اے ز کارِ عصرِ حاضر بے خبر چرب دستی ہائے یورپ را نگر

قالی از ابریشمِ تو ساختند
باز او را پیشِ تو انداختند

تم ذرا یورپ کی چالاکیوں پر غور کرو۔ وہ تمہارے ہاں سے خام پیداوار ـــــ ریشم، اُون، کپاس وغیرہ ـــــ سستے داموں خرید کر لے جاتے ہیں اور انہی سے مختلف چیزیں بنا کر پھر تمہارے ہاتھوں مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔

چشمِ تو از ظاہرش افسوں خُورد
رنگ و آبِ او ترا از جا برُد

ان کی کاریگری اتنی ہے کہ وہ ایسی چیزیں تیار کرتے ہیں جن کی چمک دمک سے تمہاری نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور اس طرح تم پر ان کا جادو چل جاتا ہے۔

وائے آں دریا کہ موجش کم تپید
گوہرِ خود را ز غواصاں خرید

کتنی بد قسمتی ہے اس قوم کی کہ جو خود اپنے ہاں کی چیزوں کو دوسروں کے ہاتھوں سے خرید لے اور اس طرح اپنی قومی دولت کو ان کے ہاں منتقل کرتی چلی جائے۔

بابِ نمبر ۱۴

در حضورِ رسالتمآبؐ

زیرِ نظر مثنوی کا یہ آخری باب ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ موضوع کے اعتبار سے وہ مثنوی تو سابقہ باب کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اس آخری باب میں علاّمہ اقبالؒ نے بحضور رسالتمآبؐ اپنی ایک فریاد پیش کی ہے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب حضرت علاّمہؒ بہت بیمار تھے، گلا بیٹھا ہوا تھا۔ بلکہ آواز قریب قریب بند ہو چکی تھی۔ آپ علاج کی غرض سے بھوپال تشریف لے گئے۔ وہاں ۳؍ اپریل ۱۹۳۶ئ کی رات، سیّد احمد خاں رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔ وہ فرما رہے تھے کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالتمآبؐ میں عرض کرو۔" یہ باب اسی عرضداشت پر مشتمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواب، انسان کی اپنی شدّتِ آرزو کی جھلک ہوتا ہے۔ بیماری کا آپ کی طبیعت پر بڑا اثر تھا۔ حضور رسالتمآبؐ کی ذاتِ گرامی سے آپ کو جو والہانہ محبّت تھی وہ ظاہر ہے۔ آپ اپنے دوست راس مسعود (مرحوم) کے مشورہ پر بھوپال تشریف لے گئے تھے۔ یوں سمجھئے کہ انہی کے مہمان تھے۔ راس مسعود، سر سیّد احمد خاں کے پوتے تھے۔ ان تمام اثرات، تصوّرات اور ماحول کا مرقع تھا جو خواب بن کر آپ کو دکھائی دیا۔

فریاد تو یہ اپنی بیماری کے متعلق ہے، لیکن حضرت علاّمہؒ کو اُمّتِ مسلمہ کے ساتھ جس قدر قلبی تعلق تھا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پہلے اس اُمّت کے لئے دُعا مانگتے ہیں اور بعد میں اپنی ذات کے لئے۔ بحضور رسالتمآبؐ عرض کرتے ہیں۔

اے تو ما بیچارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ

اے وہ ذاتِ گرامی کہ تو ہم بیکسوں اور بے بسوں کے لئے ساز و سامانِ حیات ہے۔ تو اس قوم کو

موت کے ڈر سے کسی طرح نجات دلا۔ کتنی بڑی بات ہے' جو یہاں ان چار لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔ قوموں کے زوال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ موت سے ڈرنے لگتی ہیں. جو قوم موت سے نہیں ڈرتی اسے دنیا میں کوئی نہیں مار سکتا. اور جو موت سے ڈرنے لگ جائے اسے کمزور سے کمزور حریف بھی دبا لیتا ہے۔ قرآنِ کریم نے موت کی تمنا کو دعویٰ صداقت کا ثبوت قرار دیا ہے. اس نے بتایا ہے کہ کس طرح ایک قوم ہزارہا کی تعداد کے باوجود اپنا گھر بار چھوڑ کر محض موت کے ڈر کی وجہ سے بھاگ کھڑی ہوئی! اور جب وہ اپنے نبی کی آواز پر دشمن کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو گئی تو اسے دوبارہ زندگی مل گئی. علامہ اقبالؒ نے امتِ مسلمہ کے لئے ایک ہی درخواست کی ہے اور یہ کہ اس کے دل سے موت کا ڈر نکل جائے. اور ظاہر ہے کہ اگر اس کا دل خوف کا نشیمن نہ رہے تو پھر دنیا کی کوئی قوم اس پر غالب نہیں آسکتی. کتنی جامع ہے یہ دُعا!

سوختی لاتِ و مناتِ کہنہ را
تازہ کردی کائناتِ کہنہ را

آپؐ نے دنیائے کہن کے تمام معبودانِ باطل کا خاتمہ کر کے' انسانیت کو ایسے جدید تصورات سے (جو اصل کے اعتبار سے قدیم ترین تھے) روشناس کرایا جنہوں نے اس کے سامنے زندگی کی نئی راہیں کھول دیں.

در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلوٰتِ صبح' تو بانگِ اذاں

یہ شعر علامہ اقبالؒ کے شدتِ جذبات پر مبنی ہے. اس کے بعد فرماتے ہیں.

لذتِ سوز و سرور از لَآ اِلٰہ
در شبِ اندیشہ نور از لَآ اِلٰہ

انسان جذبات اور فکر دونوں سے مرکب ہے. علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ انسان کے جذبات کی دنیا میں اگر سرور پیدا ہو سکتا ہے تو اس تصور اور عقیدہ سے' کہ کائنات میں خدا کے علاوہ کوئی صاحبِ اقتدار ہستی ایسی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے. اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو سکتی ہے. دوسری طرف انسانی فکر کی تاریکیوں میں بھی روشنی اسی نظریہ سے پیدا ہو سکتی ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں. یہ تعلیم ہمیں اس قرآن سے ملی ہے جو حضور نبیؐ اکرمؐ کی وساطت سے انسانوں تک پہنچا ہے. اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

نے خدا ہا ساختیم از گاؤ خر　　　نے حضورِ کاہناں افگندہ سر

نَے سجودے پیشِ معبودانِ پیر
نَے طوافِ کوشکِ سُلطان و میر

یہ امت ہر قسم کے شرک سے پاک رہی۔ نہ اس نے حیوانات کے سامنے اپنا سر جھکایا نہ مذہبی پیشواؤں کو اپنا خدا بنایا۔ اور دوسری طرف اس نے کسی دنیاوی فرمانروا کے آستاں پر بھی جُبّہ سائی نہیں کی۔ یہ دنیا کی ہر بڑی چوکھٹ سے سرفرازی و سربلندی کی شان لئے مستانہ وار آگے بڑھ گئی۔

ایں ہمہ از لطفِ بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

یہ سب حضور نبیٔ اکرمؐ کی بے مثال تعلیم کی وجہ سے ہوا۔ قرآنِ کریم میں حضورؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ آپؐ انسانوں کو ان زنجیروں سے آزاد کردیں گے جن میں وہ صدیوں سے جکڑے چلے آرہے تھے اور ان کے سر سے وہ بوجھل سلیں اتار دیں گے جن کے نیچے وہ دب رہے تھے۔ نوعِ انسان کو اس قسم کی آزادی قرآن کی تعلیم سے نصیب ہوئی ہے۔ اور یہ حضورؐ کی بعثت کا انسانیت پر احسانِ عظیم ہے۔

ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور
قوم را دارد بہ فقر اندر غیور

نبیٔ اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کا تذکارِ جلیلہ قوم کے دل میں عجیب انبساط پیدا کرتا ہے اور اسی سے یہ قوم، اپنے فقر میں بھی اس قدر غیرت مند واقعہ ہوئی ہے۔ (یہ تمام خصوصیات دراصل اس امتِ مسلمہ کی ہیں جو حضورؐ کی تعلیم پر عمل پیرا رہی۔ ورنہ ہماری جو حالت ہے وہ تو ظاہر ہے)۔

اے مقام و منزلِ ہر راہرو
جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو

کاروانِ انسانیت کے لئے وہی راستہ صراطِ مستقیم ہے جس پر حضور نبیٔ اکرمؐ کے نقوشِ قدم تابندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ اس سے یہ قافلہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اگر ان افرادِ کارواں کے دل میں، حضورؐ کے نقوشِ قدم کے اتباع کا جذبہ موجزن ہے تو دنیا کا کوئی سنگِ گراں ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد وہ ملتِ اسلامیہ کی موجودہ حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سازِ ما بے صوت گردید آنچناں
زخمہ بر رگ ہائے اُو آید گراں

جسدِ امت سے حرکت وحرارت بالکل ختم ہو چکی ہے اور یہ اس حد تک مُردہ اور زندگی سے بیزار ہو چکی ہے کہ اگر کوئی انہیں اس خوابِ گراں سے جگانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی آواز انہیں گراں گزرتی ہے.

در عجم گردیدہ و ہم در عرب
مصطفےٰ نایاب و ارزاں بولہب

ممالکِ اسلامیہ میں یہاں سے وہاں تک ہر جگہ یہ منظر دکھائی دے گا کہ غیر اسلامی زندگی عام ہے صحیح اسلامی زندگی کا کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا.

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ

مسلمانوں کی نئی نسل (کہ جس پر قوموں کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے) اس کی حالت یہ ہے کہ ان کی ذہنی صلاحیتیں بہت عمدہ ہیں لیکن سیرت و کردار کے اعتبار سے ان کے دل تاریکیوں کے غار ہیں جن میں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی.

در جوانی نرم و نازک چوں حریر
آرزو در سینۂ اُو زود میر

ان نوجوانانِ ملت کی سہل انگاری کی یہ کیفیت ہے کہ یہ عالمِ شباب ہی میں نرم و نازک ریشم کے لچھے بن جاتے ہیں. ان کے دل میں اوّل تو کسی بلند مقصد کے لئے کوئی آرزو پیدا ہی نہیں ہوتی، اور اگر کبھی پیدا ہو تو بہت جلد مر جاتی ہے.

ایں غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
حریت اندیشۂ اُو را حرام

اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ صدیوں کی غلامی سے ان کے دلوں سے آزادی کا جذبہ ہی مفقود ہو چکا ہے. اور دوسری یہ کہ

مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود   از وجودش ایں قدر دانم کہ بود

انہیں تعلیم ایسی غلط ملی ہے جس سے ان کے دل سے دین کا تصوّر تک مٹ چکا ہے یہ آب و گل کے پیکر ہیں.
ان کا وجود (جو انسانی خودی کا مرکب ہوتا ہے) اس کے متعلق یہ سمجھو کہ — ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے.

این ز خود بے گانہ، این مستِ فرنگ
نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ

اس تعلیم نے اسے اپنے تصوراتِ حیات اور نظریاتِ زندگی سے یکسر بیگانہ بنا دیا ہے اور یہ مغرب کی اندھی تقلید میں فخر محسوس کرتا ہے. اور بے غیرتی کا یہ عالم ہے کہ اپنی روٹی تک کے لئے ان اقوام کا محتاج ہے

ناں خرید این فاقہ کش با جانِ پاک
داد ما را نالہ ہائے سوزناک

اس کی حالت یہ ہے کہ یہ ان اقوام سے روٹی حاصل کرتا ہے اور اس کی قیمت میں اپنی جان دے دیتا ہے
اس کی اس حالت کے تصوّر سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو جاتا ہے.

دانہ چیں مانندِ مرغانِ سراست
از فضائے نیلگوں ناآشناست

اس کی آرزوئیں نہایت پست اور اس کے مقاصد بڑے ذلیل ہیں. طبیعی زندگی اور اس کا سازو سامان، اس کا منتہائے نگاہ ہے. یہ زندگی کے بلند مقاصد سے یکسر ناآشنا ہے. درحقیقت اس میں ان نوجوانوں کا بھی چنداں قصور نہیں.

شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر
از مقامِ او نداد اُو را خبر

سارا قصور اس کے اساتذہ کا ہے جنہوں نے اسے کبھی بتایا ہی نہیں کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے. اور یہ اس لئے کہ خود یہ اساتذہ بھی وسعتِ نظر اور بلندیٔ نگاہ سے محروم ہیں. یہ دوں ہمت، پست فطرت اور کوتاہ نگاہ متعلّمین کے دلوں میں بلند جذبات کو کس طرح بیدار کر سکتے ہیں. اور یہ اس لئے کہ

آتشِ افرنگیاں بگداختش
یعنی این دوزخ دگرگوں ساختش

یہ اساتذہ خود بھی تو اسی مغربی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے سکّے ہیں. ان سے خیر کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے.

نتیجہ اس کا یہ کہ اس اُمت کی یہ نئی پود، مغربی جہنم میں پگھل کر کچھ کی کچھ بن چکی ہے۔

مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست
در دلش لَا غالب اِلَّا اللہ نیست

اس تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کے نوجوان اس حقیقت سے یکسر ناآشنا ہو چکے ہیں کہ حیاتِ بے شرف کا نام موت ہے اور مرگِ بے شرف، حقیقی زندگی ہے۔ موت اور حیات کے اس راز سے بیگانہ ہو جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا دل ہر وقت معبودانِ باطل کے خوف کی آماجگاہ بنا رہتا ہے اور یہ تصور ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے کہ رازِ زندگی یہ ہے کہ خدا کے سوا دنیا میں کسی کو صاحبِ غلبہ و اقتدار نہ سمجھا جائے۔

تا دلِ اُو در میانِ سینہ مُرد
می نیندیشد مگر از خواب و خورد

جب زندگی کے بلند مقاصد سامنے نہ رہیں اور اس طرح سینے میں دل مُردہ ہو جائے تو پھر مقصدِ حیات "کھاؤ، پیو اور مر جاؤ" کے سوا کچھ اور نہیں رہتا۔

بہرِ یک ناں نشترِ لَا و نعم
منتِ صد کس برائے یک شکم

پھر انسان، محض روٹی کی خاطر در بدر کی خاک چھانتا ہے اور ہر ایک سے جھڑکیاں کھاتا ہے۔ پیٹ، اسے اس قدر ذلیل و خوار کرتا ہے کہ اس کی زندگی حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔

از فرنگی می خرد لات و منات
مومن و اندیشۂ اُو سومنات

یہ مغربی بُت کدوں سے مختلف قسم کے بُت خریدتا ہے۔ نام کے لحاظ سے مومن (یا مسلمان) ہے لیکن اس کا دماغ ان بتوں کا معبد بن رہا ہے۔

قُم بِاِذنی گوے و اُو را زندہ کُن
در دلش اللہ ھُو را زندہ کُن

اب حضرت علامہؒ، حضور رسالتمآبؐ سے درخواست کرتے ہیں کہ اس مردہ قوم کو از سرِ نو زندہ کر دیجئے۔ یعنی اس کے دل میں، خدا کے صحیح تصور کو بیدار کر دیجئے۔ اس سے اسے حیاتِ نو مل سکتی ہے۔

ما ہمہ افسونیٔ تہذیبِ غرب
کشتۂ افرنگیاں بے حرب و ضرب
تو ازاں قومے کہ جامِ او شکست
وا نما یک بندۂ اللہ مست

ہم سب ساحرینِ افرنگ کے سحر سے مسحور ہو چکے ہیں. ہمیں انھوں نے، بغیر جنگ و جدل آغشتۂ خاک و خون کر دیا ہے. اب آپؐ اس قوم کے اندر (جس کے جام و سبو سب ٹوٹ چکے ہیں) ایک ایسا مردِ حق ہیں پیدا کر دیں جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے اور اس کے قوانین کی اطاعت کا عشق اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہو.

"تا مسلماں باز بیند خویش را
از جہانے برگزیند خویش را"

تاکہ یہ امت پھر اپنے آپ کو اپنی حقیقی شکل میں دیکھ لے اور دنیا میں پھر سے وہ مقام حاصل کر لے جسے یہ اس طرح کھو بیٹھی ہے.

اس کے بعد دوسرا بند شروع ہوتا ہے جس میں علامہ اقبالؒ نے اپنی ذاتی درخواست پیش کی ہے. کہتے ہیں.

شہسوارا! یک نفس درکش عناں
حرفِ من آساں نیاید بر زباں
آرزو آید کہ ناید تا بہ لب؟
می نہ گردد شوق محکومِ ادب

جس درخواست کو وہ پیش کرنا چاہتے ہیں اس کے متعلق خود ہی اضطراب میں ہیں کہ معلوم نہیں وہ زبان تک آبھی سکے یا نہیں. ایک طرف آرزو کی شدت ہے کہ نغمۂ بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے ــ اور دوسری طرف حضورؐ کا ادب عناں گیر ہے.

آں بگوید لب کشا اے دردمند
ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند

شوق کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی دردمندی کا حال زبان تک لاؤ۔ دوسری طرف ادب کا اشارہ ہے کہ زبان بند رکھو صرف آنکھ کھولو۔

گردِ تو گردد حریمِ کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات

پہلا مصرعہ ہمارے خیال میں نعتِ رسالتمآبؐ کے لٹریچر میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ حضورؐ وہ مرکز ہیں جن کے گرد تمام کائنات گردش کرتی ہے۔ انہی سے اقبالؒ ایک نگاہِ التفات کا ملتجی ہے۔

ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی
کشتی و دریا و طوفانم توئی

حضورؐ کو اپنی ہستی اور اس کے تمام جوہروں کا مرکز قرار دے کر عرض کرتے ہیں۔

آہوئے زار و زبون و ناتواں
کس بہ فتراکم نہ بست اندر جہاں

میں ایک ایسا ہرن ہوں جس کی دنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اسی لئے کسی شکاری نے مجھے اپنا نخچیر نہیں بنایا۔

اے پناہِ من حریمِ کوئے تو
من بامیدے رمیدم سوئے تو

دنیا میں میرے لئے پناہ گاہ صرف آپؐ کا کوچہ ہے۔ اسی لئے میں ہر طرف سے کٹ کر اس میں پناہ لینے کے لئے آگیا ہوں۔

آں نوا در سینہ پروردن کجا
وزدمے صد غنچہ وا کردن کجا
نغمۂ من در گلوئے من شکست
شعلۂ از سینۂ ام بیروں نجست

اب آپ نے اپنی بیماری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے اس بیماری سے آپ کی آواز بند ہو گئی تھی۔ یہ مرض تکلیف دہ ہونے کے علاوہ کس قدر اضطراب انگیز تھا اس کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ جس مفکر کے دماغ میں ہر وقت نئے نئے خیالات کا ہجوم رہتا ہو۔ جس کے دلِ دردمند میں آرزوؤں اور

ولولوں کا جوش اٹھتا ہو اس کی جب یہ کیفیت ہو جائے کہ نہ حلق سے آواز نکلتی ہو اور نہ ہی وہ (بینائی کی کمزوری، بلکہ قریب قریب جاتے رہنے کی وجہ سے) کچھ لکھ ہی سکتا ہو، سوچئے کہ اس گھٹن سے اس کی قلبی کیفیت کیا ہو گی۔ یہی وہ اضطراب ہے جس کے متعلق آپ کہتے ہیں کہ

در نفس سوزِ جگر باقی نماند
لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

خستہ اور شکستہ آواز میں تھوڑی بہت بات تو ہو جاتی ہے لیکن جو بات کرنے میں سوزِ جگر کا مظاہرہ ہوتا تھا وہ باقی نہیں رہا۔ اور سب سے بڑھ کر قلق اس بات کا ہے کہ علی الصّبح تلاوتِ قرآنِ کریم میں جو لطف آتا تھا وہ جاتا رہا۔ (حضرت علامہؒ بڑے خوش الحان تھے اور قرآنِ کریم کی تلاوت تو بڑے ہی جذب و کیف سے کیا کرتے تھے)۔

نالۂ کو می نہ گنجد در ضمیر
تا کجا در سینہ ام ماند اسیر
یک فضائے بے کراں می بایدش
وسعتِ نُہ آسماں می بایدش

وہ فغانِ درد آمیز جو ضمیر کی گہرائیوں سے اُبھر کر سطح پر تو آجاتے لیکن اس کے بعد وہ سینے میں گھٹ کر رہ جاتے اور لب تک نہ آسکے، اس سے قلبِ حساس پر کیا قیامت گزرتی ہو گی! یہ وہ چیزیں ہیں جن کے اظہار کے لئے تو کائنات کی بسیط فضا بھی تنگ ہوتی ہے چہ جائیکہ یہ سینے میں دب کر رہ جائیں۔

آہ زاں دردے کہ در جان و تن است
گوشۂ چشمِ تو داروئے من است

میری یہ بیماری کہ جس سے مجھے جسمانی تکالیف ہی نہیں بلکہ قلبی اذیت بھی پہنچ رہی ہے اس کا علاج حضور رسالتمآبؐ کی نگہِ کرم کے سوا کچھ نہیں۔

در نسازد با دوا ہا جانِ زار تلخ و بویش بر مشام ناگوار
کارِ ایں بیمار نتواں برد پیش
من چو طفلاں نالم از داروئے خویش

تلخیِ او را فریبم از شکر
خندہ ہا در لب بدوزد چارہ گر

اس کے بعد حضرت علامہؒ نے اپنی ایک کمزوری کا بھی کھلے الفاظ میں اظہار کر دیا ہے۔ یہ کمزوری انہی کی نہیں بلکہ ہر اس شخص کی ہوتی ہے جس کے جذبات شدید اور حسیات نازک ہوں۔ آپ دوا سے بہت گھبراتے تھے۔ بالخصوص ایلوپیتھی دواؤں سے جن کا مزہ تلخ اور بو ناگوار ہوتی تھی۔ کہتے ہیں کہ میں دوائی کے نام سے بچوں کی طرح چلّا اٹھتا ہوں۔ اب بھلا بتلائیے کہ جس مریض کی حالت یہ ہو اس کے مرض میں افاقہ کس طرح ہو سکتا ہے، ایک طرف تو مرض کی یہ کیفیت اور دوسری طرف طبیب کی یہ حالت کہ وہ میرے اس طفلانہ پن کو دیکھ کر زیرِ لب مسکرا دیتا ہے۔ اور اس سے بھی مجھے کوفت ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ کشمکش جس میں مبتلا ہوں۔ اس لئے

چو بصیری از تو می خواہم کشود
تا بمن باز آید آں روزے کہ بود

بصیریؒ مشہور قصیدہ بردہ کا مصنف ہے جو نبیؐ اکرمؐ کی نعت میں ہے۔ کہتے ہیں کہ بصیری کا یہ قصیدہ بارگاہِ رسالتمآبؐ میں مقبول ہوا اور اسے فالج کے مرض سے نجات مل گئی۔ حضرت علامہؒ بحضور رسالتمآبؐ درخواست کرتے ہیں کہ بصیری کی طرح مجھ پر بھی نگہِ کرم ہو جائے تاکہ مجھے وہ تندرستی دوبارہ مل جائے جو کبھی مجھے حاصل تھی۔

مہرِ تو بر عاصیاں افزوں تراست
در خطا بخشی چو مہرِ مادر است

حضورؐ کی نگہِ کرم گنہگاروں پر اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ آپؐ ان کی خطائیں اس طرح بخش دیتے ہیں جس طرح ماں اپنے بچوں کے قصور معاف کر دیتی ہے۔

اس کے بعد آپ جسمانی مرض کو چھوڑ کر پھر اپنے مقصد کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں۔

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز

میری جنگ ان لوگوں سے ہے جو تاریکیوں میں رہنا پسند کرتے ہیں اور میں انہیں قرآن کی روشنی کی طرف لانا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے میری درخواست یہ ہے کہ میرے چراغِ فکر میں اور تیل ڈال دیا جائے تاکہ اس کی روشنی دائم و قائم رہے۔

اے وجودِ تو جہاں را نوبہار
پرتوِ خود را دریغ از من مدار
"خود بدانی قدرِ تن از جاں بود
قدرِ جاں از پرتوِ جاناں بود" (رومی)

آپ پر یہ حقیقت روشن ہے کہ جسم کی قدر جان سے ہوتی ہے اور جان کی قدر و قیمت محبوب کے پَرتَو سے ہوتی ہے۔ آپ میرے محبوب ہیں۔ آپ اپنا پَرتوِ حیات بخش میری جانِ ناتواں پر ڈال دیجئے۔

تا زغیر اللہ نہ دارم ہیچ اُمید
یا مرا شمشیر گرداں یا کلید

میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور سے کوئی اُمید نہ رکھوں۔ اس کے لئے یا تو مجھے (ساز و سامان کی رُو سے) اتنی قوت حاصل ہوجائے کہ میں تمام موانعات کی رسیوں کو کاٹ پھینکوں اور یا ذہنی طور پر ایسی صلاحیت مل جائے کہ میں ہر عقدۂ مشکل کا حل دریافت کرلیا کروں۔

فکرِ من در فہمِ دیں چالاک و چُست
تخمِ کردارے زخاکِ من نہ رُست

اس میں شُبہ نہیں کہ مجھے اس قدر علم و بصیرت عطا ہوئی ہے کہ میں دین کے اسرار و رموز کو خوب سمجھتا ہوں لیکن افسوس کہ میرا عمل، قرآن کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ میں آئیڈیل مومن نہیں بن سکا۔

تیشہ ام را تیز تر گرداں کہ من
محنتے دارم فزوں از کوہ کن

میرے تیشے کو اور تیز کر دیجئے۔ اس لئے کہ میرے راستے میں جو سنگ ہائے گراں ہیں وہ بڑے ہی سخت ہیں۔ انہیں توڑنے کے لئے مجھے کوہ کن سے بھی زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔

مومنم، از خویشتن کافر نیم
بر فسانم زن کہ بد گوہر نیم

میں بے عمل تو ضرور ہوں، لیکن اس کے باوجود "مومن" ہوں۔ یعنی میں اپنی خودی کا "منکر" نہیں ہوں۔ حضرت علامہؒ کا نظریہ یہ تھا کہ خدا کے منکر سے کہیں زیادہ کافر وہ ہے جو اپنی خودی (ذات) کا منکر ہے۔ اسی لئے

انہوں نے کہا تھا کہ

شاخِ نہالِ سدرۂ، خار و خسِ چمن مشو
منکرِ اُو اگر شوی، منکرِ خویشتن مشو

بات ہے بھی ٹھیک۔ دین کی ساری عمارت انسانی ذات پر ایمان کی بنیادوں پر اٹھتی ہے۔ جو شخص محض جسمانی زندگی ہی کو منتہیٰ سمجھتا ہے، اس کا خدا پر ایمان لانا بے معنی ہے۔ خدا، وحی، رسالت، آخرت پر ایمان کی ضرورت ہی اس لئے پڑتی ہے کہ انسان اس حقیقت پر ایمان رکھے کہ زندگی اسی جسم کی زندگی نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے، اور مقصدِ زندگی اس کی نشوونما ہے۔ جو اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے وہ "مومن" ہے۔ اس کا اظہار حضرتِ علّامہؒ نے کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ میری شمشیر اگرچہ اس وقت بڑی زنگ آلود ہے لیکن یہ ہے اصلِ فولاد کی ساختہ۔ اس لئے اسے آپؐ اپنی توجہات کی سان پر چڑھا دیجئے تاکہ یہ صیقل ہو جائے اور اس کی کاٹ تیز تر ہو جائے۔

گرچہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است
چیزکے دارم کہ نامِ اُو دل است

اگرچہ میری عمر بڑی ناکام گذری ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنے سینہ میں ایک متاعِ عزیز رکھتا ہوں جسے دل کہتے ہیں۔

دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں
کز سُمِ شبدیزِ تو دارد نشاں

میں اسے دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتا ہوں، اس لئے کہ اس میں حضورؐ کے عشق کا درد پنہاں ہے۔ (اس پر آپؐ کے گھوڑے کے سُم کا نشان ہے)۔

بندہ را کو نخواہد ساز و برگ
زندگانی بے حضورِ خواجہ مرگ

وہ غلام جو ساز و سامانِ حیات کچھ نہ چاہتا ہو، اس کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت اپنے آقا کے حضور حاضر رہے۔ اگر اسے یہ دولت میسّر نہ ہو تو اس کی زندگی موت کے برابر ہوتی ہے۔

اے کہ دادی کُرد را سوزِ عرب
بندۂ خود را حضورِ خود طلب

آپؐ نے کُرد کو سوزِ عرب عطا کردیا۔ میری التجا یہ ہے کہ آپؐ اپنے اس غلام کو اپنے حضور طلب فرمالیں۔

کہتے ہیں کہ ایک کُرد کو حضورؐ سے والہانہ محبت تھی۔ اس نے ایک دفعہ التجا کی کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں حضورؐ کی محبت کا دعوےٰ کروں لیکن حضورؐ کی زبان (عربی) سے ناآشنا ہوں۔ تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ رات کو اس نے یہ دُعا کی اور صبح کو وہ عربی زبان میں بے تکلفی سے گفتگو کرنے لگا۔ تصوّف کی کتابوں میں اس قسم کے قصّے کہانیاں اکثر ملیں گی۔ شاعر کو تحقیق سے غرض نہیں ہوتی۔ وہ ہر مروّج و مشہور حکایت سے فائدہ اٹھالیتا ہے۔

بندۂ چوں لالہ داغے در جگر
دوستانش از غمِ اُو بے خبر

یہ حضورؐ کا غلام وہ ہے جس کا جگر داغ داغ ہے۔ لیکن جس کے دوست اس کے غم سے بالکل بے خبر ہیں۔

بندۂ اندر جہاں نالاں چوں نے
تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے

وہ غلام جو دردِ فراق سے بنسری کی طرح نالہ فگن ہے۔ اور جس کی جان مسلسل آہ و فغاں سے بالکل سوختہ ہو چکی ہے۔

در بیاباں مثلِ چوبِ نیم سوز
کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز

میری حالت اُس نیم سوختہ لکڑی کی سی ہے جسے قافلہ اپنے کوچ کرنے کے بعد جنگل میں جلتے چھوڑ گیا ہو۔ قافلہ چلا گیا۔ کوئی اور مونس و غم خوار موجود نہیں اور وہ لکڑی تنہا جلے جارہی ہے۔

اندریں دشت و درے پہناورے
بو کہ آید کاروانے دیگرے

اب وہ لکڑی اس انتظار میں ہے کہ شاید اس راستے سے کسی اور کارواں کا گذر ہو۔

جاں ز مہجوری بنالد در بدن
نالۂ من وائے من! اے وائے من

یہ ہے وہ دردِ فراق جس سے میں مسلسل آہ و فغاں بن چکا ہوں۔ کس قدر جاں گداز ہے میرا یہ درد!!

اس بند پر مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ فَلِلّٰہِ الحَمْد

پرویز

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ
جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے